IMPOSSIBLE GILLETTE.



FERDINANDO FREGA

— NANDO THE SCRIBE — フレガ・サン — Ferdinando —

ناممکن Gillette

THE SYSTEM · 09

واحد متکلم میں سنائی گئی کہانیوں کا ایک مجموعہ — مورتادیلا پر ایک باپ کے زبانی حساب کے سبق، روس سے ایک فرار، رات تین بجے ایک پھل فروش کی معذرت، ہوٹل کے پورٹر کا بھیس، پاسپورٹ کی ایک تصویر جو بیس کلو پرانی ہو چکی تھی اور ناممکن حالات سے زندہ بچ نکلنے کا ایک روزنامچہ — جن میں Gillette کوئی نوکری نہیں بلکہ مصنف کی جلد کے نیچے چلنے والا آپریٹنگ سسٹم ہے۔

ترقیمہ

فرڈیننڈو فریگا — نینڈو کاتب — پانچواں بلیڈ

ضابطۂ رویّہ کے بیانیاتی پیش رو۔ اُنہوں نے ایک ہی خیال کے گرد ایک ڈالر کا ادارتی ایکو سسٹم کھڑا کیا: فنانس کو پیسے کا مسئلہ درپیش نہیں۔ اسے رویّے کا مسئلہ درپیش ہے۔

ONEDOLLAR-STORIES ایکو سسٹم کے اندر مرتب اور منظم کی گئی۔ ڈیجیٹل ڈھانچہ: **NAPLES-POST** · **NOASPECTTIME** · **ONEDOLLAR-STORIES**۔ پہلی بار 2026 میں شائع ہوئی۔ ڈیجیٹل مطالعے کے لیے موزوں ایک صاف، جدید ٹائپوگرافک ترتیب میں کمپوز کی گئی۔ ریاستہائے متحدہ میں شائع ہوئی۔

حقِ اشاعت کا اعلان

© 2026 فرڈیننڈو فریگا۔ جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

اس اشاعت کا کوئی حصہ مصنف کی پیشگی تحریری اجازت کے بغیر کسی بھی شکل میں یا کسی بھی ذریعے سے، بشمول فوٹو کاپی، ریکارڈنگ یا دیگر برقی یا میکانکی طریقوں کے، نقل، تقسیم یا منتقل نہیں کیا جا سکتا، سوائے تنقیدی جائزوں میں شامل مختصر اقتباسات اور بعض دیگر غیر

تجارتی استعمالات کے جن کی حق اشاعت کا قانون اجازت دیتا ہے۔ اس تصنیف کا غیر مجاز استعمال، نقل یا تقسیم ممنوع ہے۔

پیش گفتار

اس کتاب کے شروع ہونے سے پہلے ایک بات سمجھ لی جائے: میں کتابیں نہیں بیچتا، میں اُن سے پیسہ نہیں کماتا، میں قارئین کو خریداروں میں نہیں بدلتا، اور میں کچھ نہیں مانگتا۔ میں منڈی کے باہر سے لکھتا ہوں، اُسے خوش کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اُس چیز کو بے نقاب کرنے کے لیے جسے وہ قابو نہیں کر سکتی۔ خود ویب نے میرا نام Gillette کی تلاش میں آگے دھکیل دیا، اور اسی لیے یہ سہ جلدی سلسلہ موجود ہے: Gillette کے آدمی کو درج کرنے کے لیے — کسی پروڈکٹ کے طور پر نہیں، کسی مہم کے طور پر نہیں، بلکہ ایک قوت، ایک کردار، ایک ڈھانچے کے طور پر۔ وہ کچھ نہیں مانگتا۔ وہ کسی چیز کی توقع نہیں رکھتا۔ پھر بھی اُسے وہ مل چکا ہے جو اہم ہے: پہچان۔ اربوں ڈالر کے نظاموں کی حکمرانی والی دنیا میں یہ کتاب اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک آواز اجازت کے بغیر، سمجھوتے کے بغیر اور قیمت کے بغیر بلند ہو سکتی ہے۔

"ناممکن GILLETTE" کا اصل مطلب کیا ہے

ناممکن GILLETTE وہ لمحہ ہے جب ایک آدمی کسی نظام کا حصہ نہیں رہتا اور خود نظام کی کسوٹی بن جاتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں **فریگا** — نظم و ضبط، باریکی اور اندرونی جیومیٹری سے تراشا ہوا آدمی — **Gillette** سے ٹکراتا ہے — وہ برانڈ جو چہرے نہیں مونڈتا، بہانے مونڈتا ہے۔

زیادہ تر لوگ کسی کمپنی میں شامل ہوتے ہیں۔ چند ایک کو وہ نئے سرے سے لکھ دیتی ہے۔ میں دوسری قسم کا تھا۔

"ناممکن" کا تعلق مشکل سے نہیں۔ اس کا تعلق ناگزیریت سے ہے — وہ نقطہ جہاں ایک آدمی کا ڈھانچہ اور ایک برانڈ کا ڈی این اے ایک ہی فریکوئنسی پر جکڑ جاتے ہیں اور جدا ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔

ناممکن Gillette = **معیاروں سے ڈھلا ہوا ایک آدمی، شناخت میں جذب ہو جانے والا ایک برانڈ، ایک زندگی جو اپنے ہی نظم و ضبط سے الگ ہونے سے انکار کرتی ہے۔**

بیان

"میں نے Gillette کو نہیں چنا۔ میرے ڈھانچے نے اپنا ہی عکس پہچان لیا۔"

یا وہ صورت جو دھات کے دروازے کی طرح دھڑام سے بند ہوتی ہے:

"میں نے Gillette کے لیے کام نہیں کیا۔ میں نے اُس کا معیار اپنے خون میں اٹھائے رکھا۔"

یہ برانڈنگ نہیں۔ یہ بلیڈ سے کندہ کی گئی سوانح ہے۔

ابتدائیہ

"کچھ آدمی حاضری لگاتے ہیں۔ کچھ آدمی ڈھالے جاتے ہیں۔ مجھے ڈھالا گیا۔ Gillette کوئی نوکری نہیں تھی — وہ میری جلد کے نیچے چلنے والا آپریٹنگ سسٹم تھی۔ اُس نے مجھے ٹائمنگ، باریکی اور وہ نظم و ضبط سکھایا جس نے مجھے کھڑا رکھا۔ اسی لیے وہ اسے ناممکن کہتے ہیں: تم اسے مجھ سے الگ نہیں کر سکتے، جب تک وہ ڈھانچہ ہی نہ اکھاڑ پھینکو جو مجھے سیدھا کھڑا رکھتا ہے۔"

پہلی کاٹ سے پہلے

زیادہ تر لوگ اپنی زندگیاں اُن نظاموں سے قبولیت پانے کی کوشش میں گزار دیتے ہیں جو اُنہوں نے خود نہیں بنائے۔ کارپوریٹ نظام۔ ادارتی نظام۔ سماجی نظام۔ خاندانی نظام۔

وہ ڈھل جاتے ہیں۔ وہ سودے بازی کرتے ہیں۔ وہ پہچانے جانے کا انتظار کرتے ہیں۔

مجھ میں وہ صبر کبھی نہیں تھا۔

میری زندگی کو تین بلیڈوں نے شکل دی۔

پہلا ایک ایسے آدمی کا تھا جس نے ایک ٹھکرائے ہوئے خیال کو جدید تاریخ کے سب سے زیادہ پہچانے جانے والے ناموں میں سے ایک بنا دیا: **کنگ کیمپ جیلٹ**۔

دوسرا میرے والد کا تھا — The Gillette Company کے اندر چالیس برس — جنہوں نے مجھے سکھایا کہ نظم و ضبط چیختا نہیں؛ وہ ناپ تول کرتا ہے۔

تیسرا نظر نہیں آتا۔ وہ میرا ہے۔ وہ صنعتوں، شناختوں، ملکوں، ناکامیوں، کامیابی، تحریر، خاموشی کو چیرتا چلا جاتا ہے — اور اُن نظاموں کو بھی جو آج تک نہیں جانتے کہ مجھے کہاں رکھیں۔

یہ کتاب کامیابی کا جشن نہیں۔ یہ یادداشتیں نہیں۔ یہ کاروبار کا کوئی رہنما کتابچہ نہیں۔ یہ منظوری کا متلاشی ادب نہیں۔

یہ اس بات کا ریکارڈ ہے کہ کیا ہوتا ہے جب ایک آدمی یہ پوچھنا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ کہاں کا ہے، اور ایسے ڈھانچے کھڑے کرنے لگتا ہے جو حقیقت کو اُسے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیں۔

کچھ نام پروڈکٹس بیچتے ہیں۔ کچھ نام غائب ہو جاتے ہیں۔ کچھ نام ہاتھ کے چلے جانے کے بہت بعد تک نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

یہ تین بلیڈوں کی کہانی ہے۔ اور اس کی کہ ایک نام کبھی کافی کیوں نہ تھا۔

مورتادیلا

میں پانچ برس کا تھا، مگر دوسروں جیسا بچہ نہیں۔ میرے والد جیسے باپ کے ہوتے، تم سمجھ جاؤ گے کیوں۔

وہ ہر پیر کو منہ اندھیرے نکل جاتے اور پورے ہفتے کے لیے غائب ہو جاتے۔ Gillette نے اُنہیں رضاعی پرورش میں لے رکھا تھا۔ وہ اُنہیں مجھے صرف جمعے کی شام لوٹاتی، جب وہ دروازے کی گھنٹی بجاتے اور میں دوڑ کر اُن کے پاس جاتا — پہلے اُن سے لپٹنے، پھر اُن کی Fiat 127 کو گیراج میں "چلانے"۔ کمپنی کی گاڑی۔

اندر وہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے۔ میں اسٹیئرنگ پر رہتا۔ ہماری باتیں کسی اور ہی جہت میں بسی ہوتیں۔

اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے حساب دماغ میں لگانا ہو گا۔ کیونکہ اگر ایک دن مجھے کیلکولیٹر نہ ملا تو میں بھٹک جاؤں گا۔ سو مشقیں شروع ہوئیں۔

"نینڈو... اگر 100 گرام مورتادیلا 800 لیرے کی ہو، اور میں 120 گرام خریدوں، تو کتنے پیسے دوں گا؟" میں نے فوراً جواب دیا۔ وہ میرے والد تھے — برسوں بعد جا کر ہی میں سمجھا کہ وہ میرے اندر کیا تعمیر کر رہے تھے۔ مگر اُن کی محبت اتنی بڑی تھی کہ اُن کی طرف سے آنے والی کوئی چیز بوجھ نہیں لگتی تھی۔

پھر اُنہوں نے بات جاری رکھی: "اور اگر میں 90 گرام خریدوں؟ اور بیاسی گرام؟" ہر بار درست جواب۔ میں اُنہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جبلّت مجھ سے کبھی جدا نہ ہوئی۔

برسوں بعد، جب میں اکاؤنٹنگ پڑھ رہا تھا، اُنہوں نے صدی کا سوال پوچھا: "اگر میں 100 پر خریدوں اور 120 پر بیچوں، تو میں کتنے مارک اپ پر کام کر رہا ہوں؟" "بیس فیصد،" میں نے کہا۔ "شاباش۔"

"لیکن اگر میں 100 پر خریدوں اور 120 پر بیچوں، اور مجھے مجموعی مارجن چاہیے، تو وہ کتنا ہے؟" اُنہوں نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اُنہیں بولنے نہیں دیا۔ "سولہ فیصد۔"

اُنہوں نے ایک لفظ نہ کہا۔ وہ مسکرائے۔ اور چل دیے۔

ایسے تھے میرے والد۔ Gillette کے بیٹوں میں سے ایک۔

نینڈو۔

چور

زیادہ تر قارئین — جو دیانت دار ہیں — اس کوشش کی طرف کھنچیں گے کہ سمجھا جائے کہ چور دراصل ہے کیا، وہ کیسے پروان چڑھتا ہے، وہ ایک ایسے کردار کے اندر کس چیز کی نمائندگی کرتا ہے جو سرے سے کوئی کردار ہی نہیں۔

مگر احتیاط: میں اطالوی پارلیمان کے ارکان کی فہرست پیش نہیں کر رہا، کسی بھی سیاسی نظریے سے بالاتر۔ میں تو بس، بصیرت اور تجربے کے سہارے، اُن لوگوں کو بیان کر رہا ہوں جنہوں نے وہ لکیر پار کی اور پھٹے بغیر واپس آنے میں کامیاب رہے، اب بھی انصاف کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے۔

یہ نہ کسی دھندے سے تعلق رکھتا ہے، نہ کسی پیشے سے۔ قانون اُسے "مجرم" تک محدود کر دیتا ہے، مگر لفظ **چور**، صاف صاف کہا جائے تو، دنیا کے کسی بھی قانونی نظام کے ضابطۂ تعزیرات میں موجود نہیں۔

ایک چور کا قول۔

جو باقی بچتا ہے وہ ایک فن ہے: ذہانت، ضرورت، موقع، ایک modus vivendi۔

سب سے مشہور معاشی اور مالیاتی چور ہیں۔ کم معروف — اور کہیں زیادہ خطرناک — ادراکی اور جذباتی چور ہیں۔

دونوں قیمت چکاتے ہیں، مگر راز ایک پرانے مجرمانہ اصول میں ہے: واردات کرنے سے پہلے تمہیں پہلے مجرم ڈھونڈنا ہوتا ہے اور ثبوت تیار کرنا ہوتا ہے۔ یہی وہ واحد عناصر ہیں جو تمہیں فرار کا ایک ممکنہ — کبھی یقینی نہیں — راستہ دیتے ہیں۔ صرف اس کے بعد ہی تم منصوبہ بنا سکتے ہو۔

ایک معزز چور اپنی گمنامی برقرار رکھتا ہے۔ وہ کبھی جیل نہیں جاتا۔ وہ توبہ نہیں کرتا۔ وہ اعتراف نہیں کرتا۔ وہ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وہ پیدا ہی ایسا ہوا تھا: کم آمیز۔

لوگ اُس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ جو غیر متوقع ہو وہ ہمیشہ واضح چیز سے زیادہ گرفت میں لیتا ہے، اُس وقت بھی جب اُس میں ایسا خطرہ ہو جس کا حساب نہ لگایا گیا ہو۔

جب عدالتی حکام کا کسی ایسے سے سامنا ہوتا ہے تو وہ اُس کی تعریف کرتے ہیں۔ اور جو چیز وہ سب سے پہلے ڈھونڈتے ہیں وہ طریقۂ کار نہیں — وہ تو تجسس کے ماروں کے لیے ہے — بلکہ لوٹ کا مال۔

یہاں بھی کردار کی شناخت خود کو ظاہر کر دیتی ہے: لوٹ کی کمائی کبھی اپنی سرحدوں کے اندر نہ رکھو۔ اور آج سرحدیں قومیں نہیں رہیں —

وہ براعظم ہیں۔

اپریل 2026 کی ایک یورپی ہدایت نے حکم دیا کہ تمام بینک آپس میں جوڑ دیے جائیں اور برادری کے ہر ملک کے ٹیکس حکام خودکار طور پر اُن کی نگرانی کریں۔ اوّلین چوروں نے اس سے بہت پہلے تیاری کر لی تھی۔

متبادل باقی براعظم ہی رہ جاتے ہیں — وہ واحد جگہ جہاں ایک چور کے وجود کی اب بھی کوئی وجہ ہے۔

جہاں تک کیتھولک چرچ کا تعلق ہے: اُس نے صدیوں کے دوران ساتویں حکم میں ترمیم کی ہے، مگر اس کے بارے میں کوئی کبھی بات نہیں کرتا۔ پرانے عہد نامے میں یہ ممانعت ایک آزاد اسرائیلی کو غلام بنا کر بیچنے کے لیے اغوا کرنے سے متعلق تھی۔ پھر یہ چوری کی ایک عمومی ممانعت میں ڈھل گئی۔

اور جب جرم ادراک کی دنیا میں منتقل ہوا تو طبی ادب کو ایک اصطلاح ایجاد کرنی پڑی: **ذہنی ہیرا پھیری**۔

دیکھتے ہیں ادب آگے کیا ایجاد کرتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے امید ہے کہ ایک دن میں **ادبی ادراکی چوری** کے پہلے الزام کی وجہ سے مشہور ہو جاؤں گا۔

نینڈو

جم

ایک باریک دھاگا ہے جو جوڑے کو جوڑے رکھتا ہے۔ "سیانے" کہتے ہیں: **پیسہ اور مفاد**۔ مریضانہ ذہن والے کہتے ہیں: **سیکس**۔ جو واقعی سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں: **جم**۔

کیوں؟ کیونکہ یہ جواب رشتوں کے 95% مسائل حل کر دیتا ہے۔

پیسہ اور مفاد

یہ صرف تب ٹکتے ہیں جب پیش کرنے کو کچھ اور نہ ہو۔ نعمت نہیں — ایک حد بندی۔ تم زندگی 50% پر جیتے ہو۔ نصفِ بہتر ہمیشہ کے لیے تالے میں بند

رہتا ہے۔

سیکس

مرد مشینی ہے: اُسے فارغ ہونے، کھو دینے، خالی ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت ادراکی ہے: وہ اپنے جسم کو ایک خفیہ کوڈ کی طرح پڑھتی ہے۔ وہ دست بردار نہیں ہوتی، سر نہیں جھکاتی، ڈھے نہیں جاتی۔ وہ چنتی ہے۔

دلچسپ حصہ

ایک جوڑا یوں جنم لیتا ہے:

وہ سوچتا ہے: "میں اُس کا پہلا ہوں، اُس کا بہترین، اُس کا واحد۔ میں نے اُسے اپنے عشق میں گرفتار کیا۔ میں نبھا لوں گا۔ میری ماں نے مجھے عورتوں کے بارے میں سب کچھ نہیں بتایا، مگر میں سنبھال لوں گا۔"

وہ سوچتی ہے: "اچھا۔ امید کرتے ہیں کہ یہ آخری ہو۔ میں اسے ٹھیک کر لوں گی۔ یہ زیادہ ہوشیار نہیں — فائدہ۔ یہ مرد ہے: آخرکار میرے کندھے پر سر رکھ کر روئے گا۔"

صبح کا سچ

وہ آئینے کے سامنے برہنہ کھڑی ہے۔ وہ اپنے جسم کا چپہ چپہ ایک نجی سلطنت کی طرح جانتی ہے۔ اُسے ایک سینٹی میٹر زیادہ دکھائی دیتا ہے، ایک خم سرکتا ہوا، ایک چھاتی جو گھٹنوں کی طرف نظریں جھکا رہی ہے۔ اور وہ سمجھ جاتی ہے: **اُس کا جسم اُس کی اضافی قدر ہے، اُس کا ہتھیار، اُس کی سفارت کاری۔**

سو وہ جم جاتی ہے۔

مگر چونکہ وہ ادراکی ہے، وہ آغاز اُس پر برس کر کرتی ہے:

"پتا ہے، کل رات تم وہ آدمی نہیں تھے جس سے میں نے شادی کی تھی۔ تین منٹ اور تم سو چکے تھے۔ تم نے خراٹے لیے۔ تمہاری توند نکل آئی ہے۔ اور تم نے دو سال سے اپنے دوست کو نہیں دیکھا۔"

بارہ سیکنڈ بعد وہ گھبرا جاتا ہے۔ "میں کیا کروں؟"

وہ جواب دیتی ہے: "تم جم چل رہے ہو۔ میں بھی آؤں گی۔ تاکہ تم بور نہ ہو۔"

اور یہیں سے مسئلہ شروع ہوتا ہے

جم کوئی جگہ نہیں۔ وہ ایک ایکو سسٹم ہے۔ اور ایکو سسٹم **غلط صحبت** کو کھینچتے ہیں۔ وہ صحبت جو آدمی کو چور بنا دیتی ہے۔ اور چوروں کے بیچ دیانت دار لوگ زندہ نہیں رہتے۔

پھر بے وفائیاں آتی ہیں۔ اور اُن کی قیمت ماہانہ فیس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

باقی سب جانتے ہیں۔ اسے سنانا صرف زخم کھولتا ہے۔ اور یہ مصنف زخم نہیں کھولتا: وہ مسکراہٹیں دیتا ہے، خیالات دیتا ہے، اور تلخی کا وہ قطرہ جو تم کبھی نہیں بھولتے۔

نینڈو

سال 2025

ٹرین اور غیر متوقع مدد

میں **فلورنس** میں ٹرین سے اترا اور ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے تھا۔

پٹریوں پر چھلانگ لگا دینا تکنیکی طور پر ممکن تھا۔ تاہم اس سے ریل کی لائن پر خون رہ جاتا۔ کسی کو اسے صاف کرنا پڑتا۔

اٹلی میں تو شاید وہ صفائی کے پیسے بھی تم سے وصول کر لیں۔

ویسے بھی میں نے خود کو کھویا نہیں تھا۔ خودکشی اُن کا کام ہے جو اپنے ادراکی حوالے کے نقطے کھو بیٹھتے ہیں۔ میرے حوالے ابھی سلامت تھے۔

اسی دوران ایک خوبصورت عورت کو اسٹیشن پار کرتے دیکھ کر مجھے زندگی یاد آ گئی۔ مجھے وہ بہت سے تجربے بھی یاد آ گئے جو میں پہلے ہی کر چکا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں اسٹیشن کے بار میں گیا اور ایک فون کرنے کی اجازت مانگی۔ میں نے اپنی بیوی کو فون کیا اور اُسے اپنا فیصلہ سمجھایا۔

میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنے بیٹوں سے ملنے **وینس** جاؤں گا۔ میں نے پہنچنے کا ٹھیک وقت بھی بتا دیا۔

یہ فیصلہ منطقی اور معقول لگا۔

میرے بچے اُس خاندان کی فطری توسیع تھے — اور آج بھی ہیں — جو میں نے بنایا۔

جب میں ٹرین میں واپس آیا تو ٹکٹ چیکر میرے پاس آیا۔ بدقسمتی سے میرے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔

اُس نے کہا کہ مجھے اگلے اسٹیشن پر ٹرین سے اترنا ہوگا۔ ورنہ وہ ریلوے پولیس کو بلا لے گا۔

اُس لمحے میں نے تین اوزار استعمال کیے: **اہلیت، تخلیقیت اور حل**۔

میں نے سکون سے سمجھایا کہ مجھے زبردستی ٹرین سے اتارنا ایک بڑا مسئلہ کھڑا کر سکتا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں پٹری پر کود کر ٹرین کو گھنٹوں کے لیے روک سکتا ہوں۔

وہ اچانک خاموش ہو گیا۔

پھر میں نے پوچھا کہ اگلے اسٹیشن تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔

"کم از کم ایک گھنٹہ،" اُس نے جواب دیا۔

اُس ایک گھنٹے کے دوران کچھ غیر متوقع ہوا۔

میرے سامنے ٹسکنی کی دو خواتین بیٹھی تھیں۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ یونیورسٹی کی پروفیسر ہیں اور کسی کانفرنس میں جا رہی ہیں۔

شروع میں ہمارے درمیان بس سادہ سی باتیں ہوئیں۔ تاہم جلد ہی تجسس نے فاصلے کی جگہ لے لی۔

کوئی تیس منٹ بعد اُن میں سے ایک لوٹ آئی۔

اُس کے ہاتھ میں ٹرین کا ایک ٹکٹ تھا۔

میرا ٹکٹ۔

ایک بار پھر عورتیں میری غیر متوقع خوش قسمتی بن گئیں۔ میں نے اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا۔

وہ انسان جسے عورت کہتے ہیں، اپنے اندر ایک ایسی گہرائی رکھتا ہے جسے بہت کم لوگ پوری طرح سمجھ پاتے ہیں۔

ٹرین سے اترنے سے پہلے اُس نے مجھے اپنا ای میل پتا دیا۔ میں بعد میں پیسے لوٹانا چاہتا تھا۔

تاہم زندگی چلتی رہی اور ایسا کبھی نہ ہوا۔

وینس اور دوسری روانگی

آخرکار ٹرین **وینس** پہنچ گئی۔

دور سے میں نے اپنے بیٹوں کو دیکھا۔

وینچینزو، 193 سینٹی میٹر۔ فرانچیسکو، 188 سینٹی میٹر۔

وہ راہداری میں بھیڑ سے اونچے کھڑے تھے۔

وہ مجھے گھر لے جانے اور دوبارہ اپنی جگہ پر کھڑا کرنے آئے تھے۔

جلد ہی اُنہوں نے بنیادی استحکام دوبارہ قائم کرنے میں میری مدد کی۔ مجھے غسل، صاف کپڑے، کھانا اور آرام ملا۔

اس کے بعد سوال شروع ہوئے۔ بہت سے سوال۔

وہ سچ مچ اپنی ماں کے بیٹے ہیں۔

چار مہینے بعد، **27 جون** کو، ایک اور فیصلہ سامنے آیا۔ خاندان کی پرانی جبلت نے مجھے پیچھے کھینچنے کی کوشش کی۔

وہ چاہتے تھے کہ میں اپنے پچھلے پیشے میں لوٹ جاؤں۔

مینیجر۔

نینڈو

اگلا حصہ

تاہم میں پیچھے نہیں جاتا۔

کبھی نہیں گیا۔

اس کے بجائے میں آگے بڑھ کر ناکامی کا سامنا کرتا ہوں۔

بہت ہی تھوڑے سے بچے ہوئے پیسوں سے میں نے ہوائی جہاز کا ایک ٹکٹ خریدا۔

منزل: **پرتگال**۔

میرے پاس کوئی واضح منصوبہ نہیں تھا۔

پھر بھی مجھے معلوم تھا کہ کیسے چلنا ہے۔

لزبن اور ہر چیز کا آغاز

پہلے میں **پورٹو** پہنچا۔ ہاسٹل میں چوبیس لوگ ایک ہی جگہ سوتے تھے۔

میرے وسائل تقریباً ختم ہو چکے تھے۔

اس لیے میں جنوب کی طرف چلا گیا جہاں زندگی سستی ہے۔ میں تقریباً پانچ سو کلومیٹر دور **بیجا** پہنچا۔

تاہم ایک رات کے بعد میں **لزبن** لوٹ آیا۔

3 جولائی کو آخرکار مجھے ایک بستر مل گیا۔

مشترکہ کمرہ۔ مشترکہ فلیٹ۔

پینتیس مربع میٹر میں نو لوگ رہتے ہیں۔

طرح طرح کی ثقافتوں اور زبانوں سے وہ جگہ بھری ہوئی تھی۔

حالات کسی جدید گھر سے زیادہ کسی افریقی جھونپڑی کے قریب لگتے تھے۔

خرچ تھا **230 یورو ماہانہ، اور ساتھ 100 یورو زرِ ضمانت**۔ میں نے سب کچھ ادا کر دیا۔

اس ادائیگی کے بعد میرے پاس کوئی پیسہ نہ بچا۔

نہ کھانا۔

بس سونے کی ایک جگہ۔

اس کے باوجود وہ دور بنیادی اہمیت کا حامل بن گیا۔ اسے تین نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے:

الف) **بیس کلو** وزن کم کرنا اور اپنی خوراک کو بدل ڈالنا؛ ب) صرف **ستر یورو ماہانہ** پر گزارا کرنا؛ ج) ادارتی منصوبوں کو، کم از کم مسودوں کی صورت میں، شکل دینا۔

میں وہاں **22 نومبر 2025** تک رہا۔

آخرکار میں نے اٹلی لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ یقین دہانیوں سے لگتا تھا کہ شاید آخرکار ایسے حالات بن سکیں جن میں گزارا ہو سکے۔

مجھے امید تھی کہ بات بن جائے گی۔

پھر بھی میں ضرورت پڑنے پر دوبارہ نکل جانے کے لیے تیار رہا۔

پھر کچھ غیر معمولی ہوا۔

9 دسمبر سے 26 دسمبر تک، صرف **17 دنوں** میں، سب کچھ بدل گیا۔

پچھلے تین برس اچانک تیاری بن گئے۔

اب دنیا مجھے دیکھ سکتی تھی۔

اور آخرکار میں اُنہیں دیکھ سکتا تھا۔

کوئی بچولیا نہیں۔

عمل کو قابو میں رکھنے والا کوئی پلیٹ فارم نہیں۔

میں اپنے عمل کے اندر آزاد رہتا ہوں۔

میں وہی رہتا ہوں جو میں ہوں۔

کرسمس مبارک۔ ابا۔

مصنف کا غور و فکر

2025 کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مجھے اب ٹوٹ پھوٹ کا سال نظر نہیں آتا۔ اس کے بجائے مجھے وضاحت کا سال نظر آتا ہے۔

خالی ہاتھ نکلنے نے مجھے ملکیت اور شناخت کے درمیان فاصلہ ناپنے پر مجبور کیا۔ پیسہ، آسائش اور یقین جلد ہی غائب ہو گئے۔ تاہم اُن سے زیادہ مضبوط کوئی چیز باقی رہی۔

جب باقی سب کچھ ڈھے جائے تو شناخت بچی رہتی ہے۔

اُن غیر مستحکم مہینوں نے چھلنی کا کام کیا۔ وہم غائب ہو گئے۔ توقعات تحلیل ہو گئیں۔ مانگے کے کردار آخرکار جھڑ گئے۔

جو بچا وہ بنیادی تھا۔

آزادی۔

اس کے بعد آنے والے منصوبے کسی حکمتِ عملی سے نہیں ابھرے۔ بلکہ وہ ضرورت سے پروان چڑھے۔

آخر میں، اُس سال نے کچھ بھی تباہ نہیں کیا۔

اُس نے وہ ظاہر کر دیا جو پہلے سے موجود تھا۔

کیوبائیوں کو پڑھانا

جب میں میامی اترا تو مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ اُس شہر میں "امریکی" کچھ زیادہ باقی نہیں بچا۔ وہ جگہ بہتر ایئر کنڈیشننگ والا کیوبا تھی۔ مجھے لینے آنے والا ٹیکسی ڈرائیور، ظاہر ہے، کیوبائی تھا۔ سب سے پہلے وہ پوچھتا ہے: کیا میں اکیلا ہوں اور کیا مجھے کوئی ساتھ چاہیے۔ نہ سپر مارکیٹیں، نہ شاپنگ مال، نہ پوسٹ کارڈ والا امریکہ۔ ایک بالکل ہی دوسری دنیا۔

اُس پہلی شام، جب میں گھر پر اکیلا تھا، کسی نے دروازے پر دستک دی۔ پولیس۔ اُنہوں نے مجھے حیران تو کیا، مگر وہ کوئی مصیبت کھڑی کرنے نہیں آئے تھے۔ وہ مجھے یہ اطلاع دینے آئے تھے کہ اگلی صبح امریکی قونصل خانے میں میری ملاقات طے ہے۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے۔

اگلے دن میں وقت پر پہنچا۔ پچاس کے پیٹے کے ایک آدمی نے دروازہ کھولا اور بتایا کہ جلد ہی میری ملاقات کنسلٹنٹ سے ہوگی۔ پھر وہ نمودار ہوئی: لمبی، دبلی، سنہرے بالوں والی، نفیس، سر سے پاؤں تک سلیقے سے سنوری ہوئی۔ اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور یاد دلایا کہ ہم برسوں پہلے روم میں ملے تھے، جب وہ وزارتِ تعلیم میں اوّلین ایگزیکٹو ڈائریکٹر کے طور پر کام کرتی تھی۔

”یقیناً مجھے آپ یاد ہیں۔ آپ کیسی ہیں؟“ میں نے کہا، اُسے دوبارہ دیکھ کر سچ مچ خوش ہوتے ہوئے۔

اُس لمحے سے روم میں کوئی کبھی یہ نہ سمجھ سکا کہ میں نے تنخواہ پوچھے بغیر ہی اُس کی پیشکش کیوں ٹھکرا دی۔ وہ ایک بڑی پیشکش تھی، سنجیدہ — مجھ جیسے سادہ آدمی کے لیے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ، پیسے سے پرے، جاہ طلبی سے پرے۔

”میں چاہتی ہوں کہ آپ کم از کم 30 دن نوجوان کیوبائی مینیجروں کے لیے تربیت اور ابلاغ کے ایک منصوبے پر کام کریں۔ آپ کو جو چاہیے ملے گا، اور اس سے بھی زیادہ۔ براہِ کرم، انکار نہ کیجیے گا۔“

کلاسیں 10 سے 12 بجے تک ہوتیں، پھر 2 سے 5 بجے تک۔

مجھے پہلا سبق یاد ہے: تقریباً پچاس لوگ، آدھے مرد، آدھی عورتیں، سب پیشہ ور۔ معمول کے تعارف کے بعد — نام، خاندانی نام، عمر، بلند آواز میں — میں نے کیوبائی لطیفے سنا کر اپنی ہسپانوی کو رواں کرنا شروع کیا۔ سب جاننا چاہتے تھے کہ میں کیوبا کے کس حصے سے آیا ہوں۔

غور و فکر کا پہلا حقیقی لمحہ تب آیا جب میں نے *پڑھانے* اور *ابلاغ* کے درمیان فرق واضح کیا — ایک ایسی چیز جو بہت سے اطالوی سمجھتے تک نہیں۔

دن اُڑتے گئے، اور آخر میں سب کچھ ایک کیک پر ختم ہوا جو طلبہ نے میرے لیے بنایا تھا۔ وہ ساتھ گزارے ہوئے 30 دنوں پر خوش تھے۔ ہر کوئی میرا

فون نمبر چاہتا تھا۔ وہ یہ جان کر دنگ رہ گئے کہ میں نہ شراب پیتا ہوں، نہ سگریٹ، نہ منشیات لیتا ہوں۔

اپنی جوانی میں میں رگبی کا کھلاڑی رہ چکا تھا — ایک کھلاڑی کی ذہنیت۔ اس دوران اطالوی کنسلٹنٹ نے مجھے جشن منانے کے لیے، اور آخرکار یہ سمجھنے کے لیے کہ وہ کیا کھو رہی تھی، کھانے پر بلایا۔ لوگ مجھ سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ وہ مجھے بس بھلا ہی نہیں سکتے تھے۔

میں ایک خوش قسمت آدمی ہوں، میرے سامنے ہمیشہ دو امکان ہوتے ہیں: پہلا، ایک شاندار عورت جو 30 دن کی خاموشی کے بعد مجھے کھانے پر بلاتی ہے؛ دوسرا، میری تقدیر کی آواز جو مجھ سے کہتی ہے کہ جانے کا وقت آ گیا ہے۔

ایک رسمی بوسہ، ایک الوداع، اور وہ مجھ سے پوچھتی ہے: "کہاں جا رہے ہیں آپ؟ مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں؟"

الوداعی بوسہ دیا۔ چلا گیا۔ اور کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ آزادی کی قیمت مجھے ہمیشہ آسائش سے زیادہ چکانی پڑی ہے۔

نینڈو

کیلے

سیکھا ہوا سبق

اپنی زندگی کے تیسرے دور میں میرے کھانے کے نئے معمول میں صبح کے وقت کیلے شامل ہیں۔ جب وہ ایک رات پہلے ختم ہو جائیں تو اگلا دن ایک خلا سے شروع ہوتا ہے۔

2025 میں دسمبر کی ایک صبح میں اپنے گھر کے نیچے والے پھل فروش کے پاس گیا۔ میں اُسے پینتالیس برس سے زیادہ سے جانتا ہوں۔ اُس نے مجھے سلام کیا، کہا "پھر سے خوش آمدید"، اور پوچھا کہ مجھے کیا چاہیے۔

— کیلے۔ اگر پکے ہوئے ہوں، سستے والے بھی، تو مجھے وہی پسند ہیں۔ — نہیں، میں آپ کو صرف یہ دے سکتا ہوں — اُس نے جواب دیا۔

قیمت: 1.45 یورو فی کلو۔ ہرے یا پیلے، میری مرضی۔

میں نے 5 یورو کی ایک تھیلی مانگی۔ میرے ساتھ میرا کتا تھا، اور ہمارے ہاں کتے کے ساتھ دکان میں داخل ہونا اب بھی شجرِ ممنوعہ ہے۔

گھر لوٹ کر تجسس نے — جو غربت میں گزرے بچپن کی بیٹی ہے — مجھے تھیلی تولنے پر اکسایا۔ 2.752 کلو۔ مجھے 3.99 یورو دینے چاہیے تھے۔ باقی یورو کا کسی نے ذکر تک نہیں کیا تھا۔

میں ایک بھلا آدمی ہوں۔ بردبار۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی غلطی تھی۔ مگر جب کوئی شک جنم لے تو اُس کی تصدیق کرنی پڑتی ہے۔

تین دن بعد میں پھر گیا۔ وہی معمول۔ کتا بھی ساتھ۔

— 1 یورو کے کیلے۔ اُس نے مجھے چار چھوٹے چھوٹے کیلے دے دیے۔

آئس کریم کی دکان والا میرا دوست اپنا ترازو لیے انتظار کر رہا تھا۔ 0.456 کلو۔ اصل قیمت: 0.66 یورو۔ جو ریزگاری نہیں لوٹائی گئی: 0.34 یورو۔

پہلا واقعہ ایک شک تھا۔ دوسرا تصدیق تھی۔ یقین تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک تیسرا درکار تھا۔

اُسی سہ پہر میں پھر گیا۔ وہی منظر۔ پھر سے 5 یورو دیے۔

اس بار میرا شپنگ ایجنٹ دوست انتظار کر رہا تھا۔ پیشہ ورانہ ترازو۔ 2.90 کلو۔ اصل قیمت: 4.20 یورو۔ اُس نے 5 یورو لیے۔ پھر بھی کوئی ریزگاری نہیں۔

دن گزرتے گئے۔ مجھے آدمی، حالات اور ماحول کو مدِ نظر رکھنا تھا۔ آمنے سامنے کا ٹکراؤ میرے خاندان کے لیے مسائل کھڑے کر سکتا تھا۔ کچھ لوگ لفظوں پر ردِعمل نہیں دیتے۔

مگر میرا نام فریگا ہے۔ اور لُٹ جانا میری فطرت میں نہیں۔

میرا انتقام ایک اور شکل میں آیا۔

پانچ دن بعد میں کتے کے بغیر لوٹا۔ میں نے مالک کا پوچھا — باپ کا، جو مجھ سے چند برس بڑے تھے۔

— سنیے، میرے دوست نے کہا کہ پچھلی بار کیلے کچھ زیادہ لگ رہے تھے۔ میں نے گھر پر تولے: 3.90 کلو۔ لگی ہوئی قیمت کے حساب سے مجھے 5.65 یورو دینے چاہیے تھے۔ آپ نے صرف 5 یورو لیے۔ میں فرق دینے آیا ہوں۔

اور میں نے 0.65 یورو آگے بڑھا دیے، صاف دکھاتے ہوئے۔

— الا یہ کہ وہ رعایت تھی، کیونکہ ہم چالیس برس سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

اُن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُن کی بیوی اور بچے جم کر رہ گئے۔ تجربے نے اُنہیں بچا لیا۔

— رعایت ہی تھی — اُنہوں نے کہا — ایک خاص گاہک کے لیے۔

میں نے سکے واپس جیب میں رکھ لیے۔

— شکریہ — میں نے جواب دیا۔ — مگر اب میں یہاں سے خریداری نہیں کروں گا۔ یہ "خاص گاہک" والی عنایتیں مجھے مشکل میں ڈال دیتی ہیں۔ میرے پاس ان کی کوئی وجہ نہیں۔ کوئی جواز نہیں۔ پھر بھی شکریہ۔

وہ ایک لفظ نہ کہہ سکے۔ وہ سب کچھ سمجھ چکے تھے۔

اگلے دنوں میں میں دکان کے سامنے سے گزرتا رہا۔ کوئی تبصرہ نہیں۔ صرف جھکی ہوئی نظریں۔ وہ نظریں وہ کہہ رہی تھیں جو کہنے کی ہمت اُن میں کبھی نہ ہوئی: معاف کرنا۔

سبق سادہ ہے: کسی منفی واقعے سے تم ہمیشہ کوئی مثبت چیز نکال سکتے ہو۔ میری کامیابیاں اسی طرح کام کرتی ہیں۔

میں ایسا ہی ہوں۔ اور میں اب بھی کیلے کھاتا ہوں۔

نینڈو

اگلا حصہ

صبح کے 3:23 بجے تھے۔ خنک رات۔ خاموش۔ انٹرکام بجا۔ سب جاگ گئے۔

میری بیٹی نے سرگوشی کی: "آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ آپ کا ٹرالی بیگ تو ہمیشہ آپ کے کمرے کے دروازے کے پیچھے تیار رہتا ہے۔"

اُسے میری کہانی پر یقین نہیں تھا۔ اُس نے سچ پڑھا نہیں تھا۔ اُسے مجھ پر بھروسا نہیں تھا۔ میں تو قابلِ اعتبار بھی نہیں تھا۔ اُس نے بس لفظوں کی تاویل کی تھی۔ اور اصل دکھ یہی تھا۔

میں نے انٹرکام کا جواب دیا۔ ایک آواز نے کہا: "اس وقت کے لیے معذرت، مگر مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ میں آپ کے گھر کے پاس والا پھل فروش ہوں۔"

میں نے اُنہیں اندر آنے دیا۔ اُن کی عمر تقریباً اسّی برس تھی۔ جب تک میں نے اپنا گاؤن پہنا، وہ گھر کے سب سے بڑے کمرے میں بیٹھ چکے تھے۔ ڈرائنگ روم میں۔

وہ جذباتی طور پر ٹوٹ چکے تھے۔ آنسوؤں میں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کروں۔

اُنہوں نے ایک ہی بات مانگی: "جب میں بولنا شروع کروں تو براہِ کرم مجھے ٹوکیے گا نہیں۔"

میں نے نہیں ٹوکا۔

"کل رات ہمارے درمیان وہ لمحہ گزرا تھا۔ آپ کو یاد ہے۔ آپ کیلوں کے لیے مجھے پینسٹھ سینٹ دینا چاہتے تھے، اور میں نے آپ کو رعایت دے دی۔"

"مجھے یاد ہے،" میں نے کہا۔

"آپ کے جانے کے بعد میں اپنے گھر والوں کے ساتھ میز پر بیٹھا۔ آپ نے جو سبق دیا وہ سخت تھا۔ میرے لیے۔ میری عمر کے آدمی کے لیے۔"

"میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ مجھے معاف کرتے ہیں۔ اور آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"

اُنہوں نے کپڑے کا ایک رومال تھام رکھا تھا، جس سے وہ ایک آنسو پونچھ رہے تھے جو بار بار لوٹ آتا تھا۔

"اس وقت آنے کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ سے ملے بغیر مجھے نیند نہیں آ سکتی تھی۔ اور آپ کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ ہم نے انٹرنیٹ پر آپ کا نام

تلاش کیا۔ تین ویب سائٹیں سامنے آئیں۔ سب انگریزی میں۔ ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ اُن میں کیا لکھا ہے۔ وہ کچھ بیچتی نہیں۔ وہ کچھ مانگتی نہیں۔ ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ یہ سائٹیں ہیں کیا۔"

وہ ہنس پڑے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اُن سے کھڑے ہونے کو کہا۔ میں نے اُنہیں زور سے گلے لگا لیا۔

میں نے اُن سے کہا کہ میں کوئی پروفیسر نہیں۔ کوئی استاد نہیں۔ میں کسی کو سبق نہیں دے سکتا۔ میں نے تو بس ایک باپ کی عام فہم سے کام لیا تھا، جہاں قاعدے اور اصول ہر معاشی منطق سے پہلے آتے ہیں۔

جاتے ہوئے اُنہوں نے پوچھا کہ کیا میں اُن کی دکان پر پھر آؤں گا۔ میں نے جواب دیا:

"ماضی سکھاتا ہے۔ حال کبھی بھلایا نہیں جاتا۔ مستقبل ہمارے خوابوں میں رہتا ہے، جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہم کیا بننا چاہتے ہیں۔"

"میں مستقبل سے آگے ہوں۔ کیونکہ میں نسل در نسل چلنے والی دولت بنا رہا ہوں، نہ کہ ورثے میں چھوڑنے کے لیے کچا پکا مال۔"

وہ ٹھیک سے سمجھ نہ پائے کہ میرا مطلب کیا تھا۔ یہ میرا ادراکی پہلو تھا — وہ جس میں چند لفظوں کے اندر کچھ بھی نہیں ہوتا، مگر غور سے سنو تو سب کچھ ہوتا ہے۔

نینڈو

موت کی دہلیز پر

وہ لمحہ جب آدمی سمجھ جاتا ہے کہ زندگی اُس کے لیے پہلے ہی انتخاب کر چکی ہے۔

نشخیص

جب بھی میں کوئی جیتی جاگتی کہانی سناتا ہوں، پہلے مسکراتا ہوں اور پھر حیران ہوتا ہوں کہ میں اُس سے زندہ کیسے نکل آیا۔ صورتِ حال غیر

منطقی تھی، تقریباً غیر حقیقی۔ تاہم اُس نے میری زندگی کو شکل دی، اور اسی لیے میں اسے سنانے پر خود کو مجبور پاتا ہوں۔

جنوری 2007۔ میں ایک کلینیکل لیبارٹری کے باہر آپریشن کے نتائج کا انتظار کر رہا ہوں۔ صرف تیس دن کے وقفے سے ہونے والے دو آپریشنوں کے بعد میری چھوٹی آنت سے سات کارسینوئڈ نکالے گئے تھے۔

صفائی کرنے والی ایک عورت، جسے میں صورت سے پہچانتا تھا، چپکے سے میرے پاس آئی۔

"مجھے افسوس ہے،" اُس نے کہا۔ "میں نے سنا... مہلک ٹیومر۔ آپ کو آنکولوجسٹ کو دکھانا چاہیے۔"

اُس لمحے موت سب سے قریبی امکان بن کر سامنے آئی۔ تاہم عقل نے جلد ہی مداخلت کی۔

میں نے اپنی معذور بیٹی کے بارے میں سوچا۔ فرار اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لیے مجھے زندہ رہنا تھا، اُس کا حال بنانا تھا اور اُس کے مستقبل کی حفاظت کرنی تھی۔

جلد ہی آنکولوجسٹ نے سب کی تصدیق کر دی: نیورو اینڈوکرائن ٹیومر، زندگی کی توقع تقریباً تیس دن۔

اُن لفظوں کو ذہن میں لیے میں ایک ویران ساحل پر چلتا رہا۔ اس دوران ہوا میرے چہرے سے ٹکراتی رہی، اور لہریں کوئی ایسی سرگوشی کرتی رہیں جو میں ابھی سمجھ نہیں سکتا تھا۔

فیصلہ

28 جنوری۔

میں پرانے دوستوں اور سابق گاہکوں کی تلاش میں گاڑی چلا کر نیپلز گیا۔ مجھے پیسوں اور ایک نئی شروعات کی ضرورت تھی۔ تاہم کسی نے ایک یورو بھی نہ لگایا۔

اس کے بجائے وہ بس ریستورانوں میں کھانے کی دعوتیں دیتے رہے۔

چند دن بعد، 6 فروری کو، میں نے خود کو نیپلز میں صرف 275 یورو کے ساتھ اور بغیر کسی کریڈٹ کارڈ کے پایا۔ تشخیص کے مطابق پندرہ یا بیس دن باقی تھے۔

ہائی وے سے نکلنے کے موڑ پر مجھے جنوب یا شمال میں سے ایک چننا تھا۔

پھر میری بیوی کا فون آیا۔

"گھر آ جاؤ۔"

اُسے لگتا تھا کہ وہ ڈپریشن سے بات کر رہی ہے۔ تاہم وہ یہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ میرے جسم کے اندر ہارمونز کا طوفان کیا کر رہا تھا۔

چنانچہ میں نے شمال کو چنا۔

رومانیہ

دو دن بعد میں براشوف، رومانیہ پہنچا — ڈریکولا کا علاقہ۔

یہ سفر کسی عورت کی خاطر نہیں تھا۔ بلکہ یہ خالص جبلت تھی۔

میری جیب میں بیس یورو بچے تھے۔ مرنے کے لیے کافی۔ دوبارہ تعمیر کے لیے یقیناً ناکافی۔

اس کے باوجود میں نے دوبارہ تعمیر کا فیصلہ کیا۔

ایک بار پر میں نے کیپوچینو اور کورنیتو منگوایا۔ میں نے فوراً دیکھ لیا کہ رومانیائی عورتوں میں ایک نایاب حسن تھا۔ تاہم مقامی مردوں میں اکثر مروّت کی کمی تھی۔

ویٹرس نے بھانپ لیا کہ میرے پاس ریزگاری نہیں ہے۔ مجھے چلتا کرنے کے بجائے اُس نے میری بات سنی۔ ہم تین گھنٹے باتیں کرتے رہے۔

آخرکار وہ رو پڑی اور اُس نے مجھے پیسے تک پیش کیے۔

میں نے انکار کر دیا۔

اس کے بجائے میں نے ایک سوال پوچھا:

"کیسینو کہاں ہے؟"

اُس نے الجھن میں گلی کے آگے کی طرف اشارہ کیا۔

میں بیس یورو لے کر داخل ہوا۔ صبح پانچ بجے تک میں ساڑھے چار سو لے کر نکلا۔

نینڈو

اگلا حصہ

دوبارہ تعمیر

جلد ہی میں نے 280 یورو میں چوتھی منزل پر ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ ادائیگی کی ضمانت ویٹرس نے دی۔

سہ پہر کو میری ملاقات میٹرو اسٹیشنوں پر کام کرنے والی کئی لڑکیوں سے ہوئی۔ اس دوران میں دوستیاں بنانے لگا۔

پھر سودا سلف لینے کی باری آئی۔ کاؤنٹر پر ڈیڑھ سو یورو کا کھانے پینے کا سامان آ گیا۔ تاہم میں نے صرف بارہ دیے۔ ٹونا آدھی مفت تھی، اور قصائی نے گوشت مجھے تحفے میں دے دیا۔

کیسینو میرا رات کا بینک بن گیا۔ اس دوران میرا فلیٹ آہستہ آہستہ ملنے جلنے کی جگہ بن گیا۔

میز پر کلابریا کے ذائقے باری باری آتے رہے۔ کہانیاں گردش کرتی رہیں۔ اور زندگی خاموشی سے پھر چل پڑی۔

ایک واپسی جو کبھی نہ ہوئی

دسمبر 2007۔

موت مجھے بھول چکی تھی۔

میری بیوی کا پھر فون آیا۔

"فوراً گھر آ جاؤ۔"

میرے پاس بارہ یورو بچے تھے۔ تاہم ایک ایئر لائن واؤچر کی بدولت میں بخارسٹ سے نکل سکا۔

ریجیو کلابریا کی پرواز فضا ہی میں ناکام ہو گئی۔ اس کے بجائے ہمیں زیورخ موڑ دیا گیا۔

ہوائی اڈے پر میں نے پھر فی البدیہہ راستہ نکالا۔ برٹش لاؤنج میں میں نے قطار والا کھمبا مائیکروفون کی طرح تھاما اور گانا شروع کر دیا۔

ہوسٹسیں ہنس پڑیں۔

کچھ ہی دیر بعد اُنہوں نے مجھے لندن کی ایک پرواز دے دی — اور ساتھ سو پاؤنڈ بھی۔

لندن، پیرس، روم، نیپلز۔

ہر قدم ایجاد مانگتا تھا۔ ہر لمحہ حوصلہ مانگتا تھا۔

آخرکار میں سات دن بعد گھر پہنچا۔

بعد کا منظر

میری بیوی آگ بگولا تھی۔

"کہاں تھے تم؟ اپنی لڑکیوں کے ساتھ؟"

میں مسکرایا۔

"اچھا ہے کہ وہ موجود ہیں،" میں نے کہا۔ "ورنہ میں اب تک زیورخ میں پھنسا ہوتا۔"

جلد ہی میں نے نیا کام شروع کیا: عارضی ملازمتوں کی ایک ایجنسی، تعمیرات اور سکیورٹی سروسز۔ منصوبے کا آغاز چھ ملازمین نے کیا۔ ہر مہینے منافع دوبارہ لگا دیا جاتا۔

تاہم کم ہی لوگوں کو اس پر یقین تھا۔

انہدام

2008 میں میں رومانیہ لوٹ گیا۔

ایجنسی بڑھ کر 258 یورپی ملازمین تک پہنچ گئی۔ تعمیرات کا شعبہ ایک اطالوی ملٹی نیشنل کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ اس دوران سکیورٹی کا شعبہ ایٹمی ویلڈنگ میں کام کرتا تھا۔

میں نے رومانیائی سیکھی، پڑھی، لکھی اور بولی۔ کہانیوں اور لطیفوں نے ہر دروازہ کھول دیا۔

پھر دسمبر میں میں نے سب کچھ دے دیا اور چلا گیا۔

عورتوں نے احتجاج کیا۔

"تمہارے بغیر کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔"

تین مہینے بعد سب کچھ ڈھے گیا۔

کیوں؟

کیونکہ بھوک کسی اور کو سونپی نہیں جا سکتی۔ تجربہ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ اور کام کی اخلاقیات تحفے میں نہیں دی جا سکتیں۔

اصل سبق

بے پیسہ اطالوی، جسے رومانیائی عورتوں کا سہارا ہو، کسی خواب جیسا لگ سکتا ہے۔

تاہم حقیقت کچھ زیادہ سخت سبق دیتی ہے۔

سچی بھوک صرف اُنہی کو داد دیتی ہے جو اُسے اپنے اندر لیے پھرتے ہیں۔

آخری نوٹ

جب میں پیدا ہوا تو مجھے میرے جیسا ایک خاندانی نام دیا گیا — **فریگا** — ایک ایسا نام جو اکثر چوروں اور ٹھگوں سے جوڑا جاتا ہے۔

اکسٹھ برس سے میں اس کے الٹ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

کیونکہ نام ہماری پہچان طے نہیں کرتے۔

بلکہ برانڈ کرتے ہیں۔

اور برانڈ صرف عمل سے بنتا ہے۔

نینڈو

زیر جامے کے بغیر

کل کا دن کٹھن رہا تھا، مگر گتھیاں سلجھانے والا بھی — ہمیشہ کی طرح۔ میں نے اپنا وقت کبھی بے مقصد ضائع نہیں کیا: میرا ادراکی وقت سخت قاعدوں پر چلتا ہے؛ زنانہ وقت کسی قاعدے پر نہیں۔

اور پھر بھی میں اکیلا سونے گیا، کیونکہ میری بیوی نے ایک "پاز" لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ معاف کرنا — *مینوپاز*۔ میں ہنسا۔ وہ نہیں ہنسی۔

میری بیٹی نے یہ یاد دلانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا کہ 61 برس کی عمر میں میں "بوڑھا" ہوں، اور یہ کہ مجھ میں کسی عورت کو قربت کے معاملات میں سنبھالنے کی نہ طاقت ہوگی نہ ہمت — میں یقیناً ڈھیر ہو جاؤں گا۔ وہ میری بیٹی ہے، میری زندگی۔ ایک مسکراہٹ سب کچھ کہنے کو کافی تھی۔ مگر میں ایک جملہ پھینکنے سے خود کو روک نہ سکا:

بہت سے لوگ اسے صرف غسل خانے جانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کچھ ہیرو بنے پھرتے ہیں۔ کچھ خیالات پیدا کرنے کے لیے۔ کچھ پہلے باپ بنتے ہیں اور پھر عاشق۔ اور کچھ بس اسے دیکھتے رہتے ہیں۔

میں نے اسے کل وقتی کام کا اوزار بنا لیا ہے — اور ٹیکس منبع پر ہی کٹ جاتا ہے۔

وہ ہنسی سے پھٹ پڑی، رکنے کا نام نہ لیتی۔ میری بیوی نے دوسرے کمرے سے اپنا وہی پرانا فیصلہ دہرایا: "تم شیطان ہو۔" ٹھیک ہی تو ہے۔

میں سونے کے لیے کپڑے اتار چکا تھا — رات کے 11 بجے تھے۔ ایک آرام دہ ٹریک سوٹ پہن لیا۔ ہر رات کی طرح دس منٹ فون پر، اور پھر نیند۔

صبح 5 بجے کے قریب کچھ سرک کر گر گیا۔ مجھے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ میں نے نیچے اپنے ٹراؤزر اور زیر جامے کی طرف ہاتھ بڑھایا — دونوں غائب۔

یہ کس نے کیا؟ نہ کوئی پارٹی ہوئی تھی، نہ کوئی مہمان آئے تھے، نہ کوئی دعوت۔ تو پھر تجوری کس نے کھولی؟

میں نے غور سے جانچا کہ خاندانی جواہرات ابھی موجود اور سلامت ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ میرا "پرانا دوست" مجھ سے پہلے جاگ چکا تھا، اس یقین کے ساتھ کہ کوئی کام کرنا ہے۔

کام آیا تو سہی — مگر وہ نہیں جس کا تم تصور کر رہے ہو۔ وہ جس کے لیے میں جیتا ہوں: **تمہیں ایک سچی کہانی سنانا اور تمہارے چہرے پر مسکراہٹ لانا۔**

نینڈو

ایک روسی عورت

جون 2006 — آغاز

میں اپنا ہول سیل کا کاروبار چلا رہا تھا — ہوم کیئر، پرسنل کیئر، عظمت کے وہم۔ میں سمجھتا تھا کہ میں طاقتور ہوں۔ میں بس مغرور تھا۔

جولائی، ریمینی۔ ایک تجارتی میلہ جو سابق ساتھیوں، گاہکوں، دوستوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت زیادہ عورتیں۔ تبھی میری سمجھ میں آیا کہ میلے ہوتے کیوں ہیں: تم کہتے ہو "کام"، مگر یہ تو بس دوسرے کمروں میں غائب ہو جانے کا بہانہ ہے۔

میں نے ہوسٹسوں کے ساتھ کبھی دکھی شوہر کا کردار نہیں نبھایا۔ یہ میرا انداز نہیں۔ میں ہمیشہ کہتا تھا کہ میں اپنی بیوی سے محبت کرتا ہوں، اور وہ مجھ سے — کیونکہ میں گھر پیسے اور تجربہ لے کر لوٹتا تھا، اور کسی متعدی سرپرائز کے بغیر۔

اُس رات میں نے ایک پیشہ ور کو بلایا۔ اُس کے وقت کے دو گھنٹے، صاف، سادہ، کم خطرے والے۔ یا کم از کم میرا یہی خیال تھا۔

وہ آئی: سردیوں کے سمندر جیسی حسین، بے عیب جسم، بھرپور موجودگی۔ اُس نے فوراً پیسے مانگے — وہ ڈاکٹر نہیں تھی؛ وہ پیرامیڈک سے زیادہ قریب کی کوئی چیز تھی۔

میں نے اُس کا بازو پکڑا اور کہا کہ تیار ہو جائے: میں اُسے شہر کے بہترین ریستوران لے جا رہا تھا، اور میں اُس کے اگلے 24 گھنٹے خریدنا چاہتا تھا۔

"تم مجھے کتنا دو گے؟" میں نے جیب میں جو کچھ تھا سب اُس کے حوالے کر دیا۔ وہ گننے لگی، گنتی بھول گئی، اور سمجھ گئی کہ وہ کسی اور ہی لیگ میں قدم رکھ چکی ہے۔

اُس نے پوچھا کہ کیا مجھے کوئی لت ہے، کوئی کج روی، کوئی عجیب کھیل۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں ایک ایسا آدمی ہوں جسے کھیل نے پالا، ایک ملٹی نیشنل نے تربیت دی، اور جو زندگی کا بغیر لائسنس کا تماشائی ہے۔

وہ پُرسکون ہو گئی۔ ہم پیدل ریستوران گئے — اُس نے ٹیکسی سے انکار کر دیا۔ اُس نے ایک سہیلی کو ساتھ آنے کے لیے بلا لیا۔ میں سمجھ گیا: پرایا ملک، احتیاط۔ ٹھیک ہی تو ہے۔

کھانا پُرسکون رہا، تقریباً رومانوی، مگر میں ادراکی ہی رہا۔ خاندانی جواہرات اُس کے سپرد کرنے سے پہلے مجھے جاننا تھا کہ وہ کون ہے۔

گھر واپس آ کر اُس نے راہداری ہی میں مجھ پر دھاوا بول دیا۔ بستر تک جانے کا وقت ہی نہ ملا۔ ہم نے وہ سب کچھ کر ڈالا جو ظاہر ہے، اور وہ بھی جو اُس سے آگے ہے۔

آٹھ گھنٹے بعد میں جا رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے نہ جانے کو کہا۔ چنانچہ میں نے ایک وعدہ کیا: "سال ختم ہونے سے پہلے میں تمہیں تمہارے گھر والوں سے ملانے روس لے جاؤں گا۔" اُسے میری بات پر یقین نہ آیا۔ میں نے اُس کی ای میل مانگی۔ اُس نے دے دی۔

نینڈو

سینٹ پیٹرزبرگ — زوال

نومبر 2006۔ میں نے اُسے ای میل کی: روس کی پرواز کے لیے تیار ہوں، مجھے اپنی بینک کی تفصیلات بھیجو۔ اُسے اب بھی میری بات کا یقین نہ آیا۔ تو میں نے اُس کے خاندان کو پیسے بھیج دیے۔

ٹکٹ۔ ویزا۔ میلان–سینٹ پیٹرزبرگ۔

مالپینسا پر اُس نے مزید پیسے مانگے۔ لہجہ بدل گیا — دوستانہ سے تحکمانہ۔ مجھے یہ اچھا نہ لگا۔

پرواز خاموش رہی۔ ہوائی اڈے پر اُس کی ماں ہمیں لینے آئی۔ وہ مجھے ایک اپارٹمنٹ میں لے گئیں۔ ہوٹل کی اجازت نہیں۔

ہم بازار گئے، کھانا خریدا اور خاندان کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ پھر وہ چلی گئی۔ میں اندر بند رہ گیا۔

اگلی صبح میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ تالا لگا تھا۔ اغوا نہیں — بس ایک ناپی تلی نظربندی۔

وہ 11 بجے مسکراتی ہوئی آئی۔ سہ پہر کو ہمیں شہر سے باہر ایک داچا میں مہمان بننا تھا۔

اُس کی سہیلی اور ایک لڑکا ہمیں لینے آئے۔ ہر طرف برف۔ ہم اُس کے باپ کے KGB کرنل کے گھر پہنچے۔

گفتگو میری انگریزی کے سہارے چلتی رہی۔ ولا شاندار تھا۔ بیڈے کا ہینڈل تک سونے کا تھا۔

ہر پکوان نفیس، ہر لمحے کے ساتھ ایک الگ شراب۔ پھر وہ مجھے مردوں کے ساؤنا میں لے گئے، سو میٹر دور۔ باہر منفی 20 ڈگری۔ ساؤنا کے بعد ہم برف میں ننگے کھڑے رہے۔ ایک روسی روایت۔ میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آگے کیا ہوگا۔

اُس رات میں اکیلا سویا، مائیکروفونوں سے بھرے ایک خوبصورت کمرے میں۔ وہ کہیں اور سوئی۔

صبح: کرنل کے ساتھ ناشتہ۔ پھر اُس نے مجھے اپنی گاڑیاں، اپنی موٹر سائیکلیں دکھائیں، اور بغل میں ایک پگ کتا دبائے مجھے گاڑی میں داچا کے گرد گھمایا۔

سہ پہر: سینٹ پیٹرزبرگ واپسی۔ شام: اُس نے مجھ پر حاوی ہونے کی، مجھے قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ اُسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ میں کون ہوں۔

اگلے دن ہم گاڑی میں مرکزی شاہراہ پر گھومے — 20 کلومیٹر دکانیں، برانڈ، دولت۔ کوئی غریب شہر نہیں۔ ماسکو کے بعد دوسرے نمبر پر۔

کرنل کے خاندان کے ساتھ رات کا کھانا: بیس قسم کا کیویار، نہ ختم ہونے والا کھانا، سو ڈالر فی کس۔ پھر واپس اپنی قید میں۔ اُس نے پھر سے دروازے پر تالا لگایا اور چلی گئی۔

اگلے دن وہ لوٹی۔ میں ایک لمحے کو باہر نکلا، ٹیکسی لی اور بھاگ نکلا — اپنے سارے بیگ پیچھے چھوڑ کر۔

وہ پاگلوں کی طرح فون کرتی رہی۔ آخرکار میں نے جواب دیا: "میں ہوائی اڈے پر ہوں۔" وہ اپنی ماں کے ساتھ آ پہنچی۔ اُنہوں نے پولیس میں رپورٹ کرنے کی دھمکی دے کر مجھ سے پیسے اینٹھ لیے۔ میں نے دے دیے۔ جہاز میں سوار ہوا۔ اڑ کر میلان پہنچا۔

ڈراؤنا خواب ختم ہو چکا تھا۔ مگر وہ میرے اندر اتر چکی تھی، اور یہ بات وہ جانتی تھی۔

نینڈو

زندگی میں واپسی — باہر کا راستہ

واپس اٹلی میں۔ میں کام کے سلسلے میں تورین جانے کے لیے اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ اُس کا فون آیا۔

اُس کی آواز مختلف تھی، میٹھی، شائستہ، نرم۔ نسوانی شخصیتوں کا جادو۔ میں جانتا تھا کہ وہ خطرناک ہے۔ ہار ماننے کا مطلب تھا خود کو کھو دینا۔

وہ فون کرنے سے باز نہ آئی۔ اُس نے کہا کہ جمعرات کو 18:00 بجے میں اُسے ہوائی اڈے سے لے لوں۔ 17:00 بجے میں تورینو–پیاچینزا ہائی وے پر تھا۔ رخ بدل کر وہاں پہنچ جانا آسان ہوتا۔

اس کے بجائے، میں نے قصہ ختم کر دیا۔ اور ایک حتمی بات سمجھ گیا:

عورتیں طاقتور ہوتی ہیں۔ جب اُنہیں کچھ چاہیے ہوتا ہے تو وہ لے لیتی ہیں — بغیر پوچھے۔

بعد کا غور و فکر

ہم ساؤنا سے ننگے برف میں نکل آئے۔ منفی بیس ڈگری۔ KGB کا ایک سابق کرنل مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ روسی مرد یوں ہنس رہے تھے جیسے یہ کچھ بھی نہ ہو۔

اور اُس سفر میں پہلی بار ایک سادہ سا خیال مجھ سے آ ٹکرایا:

اگر یہ معاملہ بگڑ گیا... تو میں کسے فون کروں گا؟

جواب ڈر سے بھی تیز آیا:

کسی کو نہیں۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے سچ سمجھا: میں خطرے میں نہیں تھا۔ میں اپنی دنیا سے باہر تھا۔

اور جب تم اپنی دنیا سے باہر قدم رکھتے ہو تو تمہیں تحفظ نہیں ملتا۔ تمہیں نتائج ملتے ہیں۔

نینڈو

قبرستان

مئی 1975 تھا۔ میں دس برس کا تھا جب میں نے پہلی بار وہ دہلیز پار کی۔ میں سمجھتا تھا کہ دکھ کی ایک جگہ میں داخل ہو رہا ہوں۔ میں تو بس ایک بچہ تھا۔ اس کے بجائے مجھے پتا چلا کہ اس میں صرف دو چیزیں تھیں: ایک جسم اور ایک یاد۔

جسم کنکریٹ کے ایک ڈبے میں بند کر دیا جاتا تھا — اگر تم خوش قسمت ہوتے۔ اٹلی میں یہ معمول تھا؛ دوسری جگہوں پر رسمیں بدل جاتی تھیں، مگر صرف ثقافتی وجوہ سے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

یاد تصویر کے اندر رہتی تھی۔ پاس سے گزرنے والے لوگ تمہیں پہچان لیتے یا پہلی بار دیکھتے۔ تمہارا جو کچھ بچا تھا وہ اُس تصویر میں قید تھا، اور پھول صرف ایک بات کہتے تھے: *میں نے تمہیں بھلایا نہیں۔*

مگر چونکہ میں کبھی دوسروں جیسا نہیں رہا، اس تجزیے پر رک جانا وہی کاپی پیسٹ ہوتا جو سب کہتے ہیں۔ تو چلو، قبرستان کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں: **تفریح کی ایک جگہ۔**

لوگ یہ جملہ بے وجہ نہیں دہراتے: *جنازوں پر لوگ ہنستے ہیں، شادیوں پر لوگ روتے ہیں، اور اس کے بعد... خیر، اس کی بات کوئی نہیں کرتا، مگر طلاقیں خالص مایوسی اور تنہائی سے بنتی ہیں۔* ہاہاہاہا۔

پہلی چیز جو ذہن میں آتی ہے وہ تب کی ہے جب میں سولہ برس کا تھا اور رگبی کھیلتا تھا۔ ہارمون مجھ سے آگے، عورتوں کی دنیا میرے پیچھے، اور میرے کلب کا صدر ہمیشہ "مشوروں" کے ساتھ تیار۔

اُس نے مجھے بتایا کہ قبرستان عورتوں سے ملنے کی شاندار جگہ ہوتے ہیں۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور، عجیب بات ہے، بات سمجھ میں آ گئی۔ مگر مجھ میں آزمانے کی ہمت نہ تھی — اُس عمر میں نہیں۔

وقت کو آگے بڑھاتے ہیں: 1986 کی گرمیوں کا ایک اتوار۔ میں اکیس برس کا تھا۔ میں کوسینزا کے قبرستان میں داخل ہوا — نہ میرا شہر، نہ میرا قبرستان — مگر ہارمونوں کا طوفان اب بھی وفاداری سے میرے پیچھے پیچھے تھا۔

میں قبرستان کے رکھوالے سے گپ شپ کرنے کو رک گیا۔ میرے سوالوں نے اُسے حیران کر دیا: میں یہاں کی حرکیات سمجھنا چاہتا تھا، لوگ کیسے آتے جاتے ہیں، خاص طور پر عورتیں۔ پھر میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور کہا، "جلد ملیں گے۔" اُس نے پوچھا، "کہاں؟" "یہیں،" میں نے کہا۔ "مر کر بھی ہم سب واپس یہیں آ پہنچتے ہیں۔"

اور پھر میں نے اُسے دیکھا۔ ایک عورت، پینتالیس برس کی، سیاہ لباس میں، پستہ قد، گول مٹول، دوسری قطار کے ایک طاق کے سامنے کھڑی رو رہی تھی۔ میں خاموشی سے قریب گیا۔ وہ اُس سے باتیں کر رہی تھی — بلاشبہ اپنے شوہر سے — اور پوچھ رہی تھی کہ وہ اُسے اتنی جلدی کیوں چھوڑ گیا۔

کرنے کو بس ایک ہی کام تھا: میں اُس کے برابر کھڑا ہو گیا اور میں بھی رونے لگا۔ اس سے فوراً اُس کا دفاع ڈھیلا پڑ گیا اور وہی سوال اٹھا جو اٹھنا تھا: *یہ کم بخت آدمی ہے کون؟*

چالیس منٹ بعد ہم ایک بار میں کافی پی رہے تھے۔ اور جب میری ننھی سی ٹھگ بازی والی فینٹسی اپنا سفر پورا کر چکی، تو میں نے خود کو اُس کے گھر پر پایا۔

بس اتنا کہہ دیتے ہیں کہ معاملہ آگے بڑھ گیا۔ مگر جس واحد چیز نے مجھے واقعی پریشان کیا وہ سائیڈ ٹیبل پر شوہر کی تصویر تھی، جو مجھے یوں گھور رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو: *اگر میں زندہ ہوتا تو تم مصیبت میں ہوتے۔* ہاہاہاہا۔

میں نے یہ آزمائش پھر کبھی نہ دہرائی۔ مگر ماننا پڑے گا کہ وہ ایک تجربہ تھا۔ اس پر میرا کچھ خرچ نہ ہوا۔ بس ایک ڈالر — کافی کی قیمت۔

نینڈو

طلاق

جو لوگ مجھے جوانی میں جانتے تھے — اور بعد میں بھی، میری بدلتی، تخلیقی، سماجی، پیشہ ورانہ، شناخت بدلتی شخصیت کے اندر — وہ میری شادی کے بچ جانے پر ایک ڈالر کی شرط بھی نہ لگاتے۔ پُرامید لوگوں نے، سچے خواب دیکھنے والوں نے، مجھے **تین برس** دیے تھے۔ زیادہ سے زیادہ۔

آج میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ وہ قریب تھے۔ عدد *تین* درست تھا۔ بس اُن سے ایک ہندسہ رہ گیا۔

33 برس ہو گئے ہیں۔ خوشی خوشی شادی شدہ۔ اور خوشی خوشی، آزاد۔

جب لوگ میری ازدواجی حیثیت پوچھتے ہیں — کنوارا، شادی شدہ، طلاق یافتہ، رنڈوا — تو میں اُنہیں وہ واحد جواب دیتا ہوں جو 2026 کے امریکہ میں معنی رکھتا ہے: **میں صرف مقررہ مدت کے معاہدے قبول کرتا ہوں۔** باقی سب مارکیٹنگ ہے۔

اور جب طلاق یافتہ لوگ — عادی بھگوڑے — مجھ سے راز پوچھتے ہیں، تو میں اُنہیں اپنی ابتدا کی کہانی سناتا ہوں۔ رومانوی والی نہیں۔ بشریاتی والی۔ وہ جو بیس بال کے بلے کے ساتھ دیے گئے کسی TED Talk جیسی لگتی ہے۔

کہانی یوں ہے۔

شروع میں، ابتدائی انسان — سہولت کے لیے اُسے **چیٹ** کہہ لیتے ہیں — گھریلو زندگی کے لیے بنا ہی نہیں تھا۔ اُسے خاموشی پسند تھی، کھلی جگہ پسند تھی، اور کسی کمیٹی کے اجلاس کے بغیر سانس لینے کا حق پسند تھا۔

پھر ہجرتیں ہوئیں۔ ثقافتیں گھل مل گئیں۔ لوگ ملے۔ اور اچانک دنیا نے ایک چونکا دینے والی بات دریافت کی: **انسان تب بہتر کام کرتے ہیں جب وہ یہ ڈھونگ چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اکیلے ہیں۔**

مگر اصل موڑ یہ ہے۔

ایک دن چیٹ شکار پر گیا۔ وہ چننے نکلی — پھول، رنگ، خیالات، بہتریاں۔ اُس نے غار کو اپ گریڈ کر دیا۔ وہ لوٹا اور جگہ کو پہچان نہ سکا۔

جھگڑا۔ آوازیں بلند ہوئیں۔ حدیں پار ہوئیں۔ اور تاریخ کی پہلی طلاق نے جنم لیا: **فوری منتقلی۔ نیا غار۔ کوئی اپیل نہیں۔**

خبر تیزی سے پھیلی۔ جانور تک باتیں کرنے لگے۔ سب گھبرا گئے۔ کیونکہ جب رشتے ٹوٹتے ہیں تو پورا ماحولیاتی نظام اسے محسوس کرتا ہے۔

مگر انسانیت ضدی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف لوٹ آئے۔ غلبے کی وجہ سے نہیں۔ ڈر کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ تعلق — اصلی تعلق — وہ واحد چیز ہے جو وقت سے بچ نکلتی ہے۔

پھر مذہب آیا اور اس نے شادی کے تصور کو صنعتی بنا دیا۔ ایک نظام۔ ایک ڈھانچہ۔ ایک معاہدہ جس میں سلیکون ویلی کے کسی NDA سے بھی زیادہ شقیں تھیں۔

اُنہیں اسے **انسانی افراتفری کا ادارہ** کہنا چاہیے تھا، مگر مارکیٹنگ ایک بار پھر جیت گئی۔

اور یہ ہے میرا امریکی نتیجہ، وہ جو میں ہر اُس زبان میں کہتا ہوں جو میں جانتا ہوں:

طلاق شاذ ہی حل ہوتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ شادی مکمل ہے — وہ نہیں ہے۔ مگر اگر تم اس کے اندر رہنے کو تیار نہیں ہو، تو اپنی ہی غلطی کی

قیمت چکانا وہ واحد دیانت دارانہ کام ہے جو باقی رہ جاتا ہے۔

نینڈو

ہنسنے کے لیے ایک کہانی... شاید۔

کارلو پچاس برس پہلے پیدا ہوا تھا، ایک نرم دل روح جس کی ہکلاہٹ نے کبھی اُس کا ساتھ نہ چھوڑا — اب بھی نہیں، جب وہ ایک پورا بالغ مرد ہے جو مرد ہونے کا ڈھونگ کر رہا ہے۔

ایک رات وہ ہمیں اپنے گھر کھانے پر بلاتا ہے۔ معمول کی گفتگو، میز پر شراب، اور اچانک اُس کی بیوی انجیلا اُن کے ابتدائی دنوں کے قصے سنانے لگتی ہے۔

ہم سب آگے جھک جاتے ہیں۔ کیونکہ جس کارلو کا وہ ذکر کرتی ہے... اُس سے ہم میں سے کوئی کبھی ملا ہی نہ تھا۔

"ہماری ملاقاتیں چل رہی تھیں،" وہ کہتی ہے۔ "میں ایک فارمیسی میں کام کرتی تھی۔ کارلو باہر انتظار کرتا رہتا جب تک میری شفٹ ختم نہ ہو جاتی۔ ہمیشہ خوشبو میں بسا ہوا، ہمیشہ اچھے کپڑوں میں۔"

یہاں تک تو سب معمول کے مطابق۔

"مگر پہلے تین دن،" وہ بات جاری رکھتی ہے، "وہ فارمیسی سے سیدھا گاڑی چلا کر مجھے گھر چھوڑ آتا۔ کوئی چکر نہیں۔ کوئی پہل نہیں۔ ہم جوان تھے، خون کھول رہا تھا، اور وہ... حد سے زیادہ شائستہ تھا۔ حد سے زیادہ درست۔ حد سے زیادہ کارلو۔"

چوتھی شام اُس نے اُس کی گاڑی خود چلانے کو مانگی۔ وہ مان گیا۔

وہ اُسے تین پلوں کے نیچے لے گئی — وہ جانی پہچانی جگہ جہاں جوان جوڑے بوس و کنار کو جاتے تھے۔ کارلو ہیڈلائٹس کی روشنی میں پھنسے ہرن کی طرح جم گیا۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے سرگوشی کی: "میرے... میرے پاس کوئی... حفاظتی چیز نہیں ہے۔"

اُس نے کہا فکر نہ کرو، وہ مانع حمل چھلا استعمال کر رہی ہے۔ اور کارلو نے، تسلی پا کر، کہا:

"بہت خوب۔ تو جب ہماری شادی ہوگی تو ہمیں شادی کے چھلے خریدنے نہیں پڑیں گے۔"

اُس نے سمجھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ پھر بھی اُس سے شادی کر لی۔ گھر میں، وہ کہتی ہے، "وہ برا نہیں تھا... مگر بس یوں سمجھ لو کہ مجھے اُسے بہت کچھ سکھانا پڑا۔" اور وہ وہیں رک جاتی ہے۔ شکر ہے۔

مہینوں بعد وہ حاملہ ہو جاتی ہے۔ ایک دن اُس کی پانی کی تھیلی پھٹ جاتی ہے۔ وہ اُسے فون کرتی ہے: "مجھے لینے آؤ۔ ابھی۔"

کارلو آتا ہے... پلمبر کے ساتھ۔ اُس آدمی کے ہاتھ میں ایک رسی ہے، اور دونوں گھر بھر میں "پانی کا رساؤ" ڈھونڈ رہے ہیں۔

وہ بات جانے دیتی ہے۔ وہ اُسے گاڑی میں ہسپتال لے جاتا ہے۔ وہ چار جڑواں بچوں کو جنم دیتی ہے۔

کارلو باہر چمنی کی طرح دھواں اڑا رہا ہے، سب کے سامنے شیخی بگھار رہا ہے — "چار بچے! یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں!"

دائی اُس کے پاس آتی ہے اور بڑے سکون سے کہتی ہے:

"مسٹر کارلو... چاروں بچوں میں سے ایک سیاہ فام ہے۔"

کارلو کی ہنسی رک جاتی ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔

وہ وضاحتیں مانگتا ہے۔ وہ سائنس، جینیات، اعداد و شمار، خدائی مداخلت اور ایک وکیل مانگتا ہے۔

وہ اپنے دوستوں سے پوچھ گچھ کرتا ہے۔ وہ ڈی این اے کا یوں مطالعہ کرتا ہے جیسے پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہا ہو۔ وہ ہر منظرنامے پر غور کرتا ہے، قیامت سمیت۔

آخرکار وہ اپنے نتیجے پر پہنچتا ہے: انجیلا کا کوئی پرانا بوائے فرینڈ ضرور... "ایک تلچھٹ" چھوڑ گیا ہوگا۔ اور وہ تلچھٹ صبر سے اپنی شان کے لمحے کا انتظار کرتی رہی۔

ہم سب وہاں میز پر بیٹھے ہیں، بے یقینی، مزاح اور اس امکان کے درمیان معلق — دور کا مگر مزے دار — کہ اس میں سے کچھ نہ کچھ سچ بھی ہو سکتا ہے۔

کارلو خاموشی سے سنتا ہے۔ انجیلا، آدھی رات کے سورج جیسی خوبصورت، اتنے یقین سے سناتی ہے کہ فرنیچر تک اُس پر یقین کر لیتا ہے۔

کسی کو کبھی پتا نہ چلا کہ کہانی اصل میں کیسے ختم ہوئی۔

مگر جب ہم گھر سے نکلے تو چاروں بچے الوداع کہنے باہر دوڑے آئے۔ تین سفید فام۔ ایک سیاہ فام۔

میں نے کارلو کی طرف دیکھا اور کہا:

"جب تمہاری شادی ہوئی تھی... تو کم از کم چھلے کا ناپ تو ٹھیک لیا تھا؟"

وہ سمجھا نہیں۔ اور بات وہیں ختم ہو گئی۔

نینڈو

شادی

میں کبھی سانچوں کے لیے بنا ہی نہیں تھا۔ نہ پیدائش کے وقت، نہ 62 برس کی عمر میں۔ میرے خیالات ہمیشہ سیدھی لکیر میں عمل کی طرف کوچ کرتے رہے ہیں، اور جو لفظ پیچھے رہ گئے وہ صرف بازگشت بن کر بچے — ایک لہجہ، ایک اشارہ، ایک خاموشی جو جملے سے زیادہ کہہ دیتی تھی۔

اور یہ تب شروع ہوا جب میں نے 1900 کے اوائل کے جوڑوں کو دیکھا۔ مضبوط شادیاں، لمبی زندگیاں، اور بے وفائیاں جنہیں اب تک ایجاد ہونے والے سب سے قدیم فلسفے سے سنبھالا جاتا تھا: **جو دل نہ دیکھے، اس سے آنکھ کو دکھ نہیں ہوتا۔** اُس زمانے میں بے وفائی خاندان کی ایک سرمایہ کاری تھی۔ بچے اس کی ضمنی پیداوار تھے، کام تقدیر تھا، اور شادیاں ہی واحد اصل خرچ تھیں — لفافوں سے دعوت کا خرچ نکل آتا، باقی جوڑے کے ذمے ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹی وی نہیں تھا۔ نہ ٹاک شو۔ نہ کوئی بھٹکاوا۔ بس کھانا، قربت، اور انسان ہونے کی ازلی سچائی۔

تو میں نے کیا کیا؟ میں نے شادیاں کرنا شروع کر دیں۔ ہر جگہ۔

پولینڈ، 1985۔ شادی سے پہلے کا مرحلہ ایک شاہکار تھا: وہ تمہیں سب کچھ دے دیتی، رشتے دار تم پر جان چھڑکتے، اور سب مسکراتے کیونکہ اُنہیں معلوم تھا کہ رسم کے بعد... **اگلے 50 برس تم اپنے حال پر ہوتے۔**

اور چونکہ میری پرورش آٹھ برس ایک کیتھولک بورڈنگ اسکول میں ہوئی تھی، میں نے دو مرحلوں پر اصرار کیا: پہلے روحانی رسم، قانونی کاغذات بعد میں۔ بہت بعد میں۔ بہت دیر سے۔ بلکہ... کبھی نہیں۔

1985 اور 1992 کے درمیان دنیا یہی سمجھتی رہی کہ میں تقریباً تین بار شادی کر چکا ہوں۔ رسمیں بے عیب تھیں۔ قانونی حصہ؟ میں ہمیشہ "دستیاب نہیں" تھا۔

پھر زندگی نے وہی کیا جو زندگی ہمیشہ کرتی ہے: اس نے میرے پاس ایک ایسی عورت بھیجی جو میرے گھر سے سو میٹر دور رہتی تھی۔ اُس نے نظام توڑ دیا۔ اُس نے مجھ سے اس یقین کے ساتھ شادی کی کہ یہ میرا خیال تھا۔ میں نے اُسے یہی یقین کرنے دیا۔ کیونکہ اُس سے ہار جانا ہی واحد سچی جیت لگتی تھی۔ نتیجہ: تین بچے، شادی کے تینتیس برس۔

مگر کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ 1995 اور 2015 کے درمیان میں نے دنیا بھر میں گیارہ علامتی شادیاں اور جمع کر لیں۔ وہی رسم، وہی جادو، وہی فرار۔ لوگوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ وہ اب بھی نہیں کرتے۔

اور ایک دن میں نے ایک سادہ سی بات سمجھ لی: میں روئے زمین کی ہر عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اُن سب کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ مگر میں **لمحوں** کو رکھ سکتا تھا۔ ایک وقت میں ایک۔ کیونکہ عورتیں — سب کی سب — ہمیشہ ہم مردوں سے برتر رہی ہیں۔

اور میں اب بھی یہیں ہوں، اب بھی اُنہیں فتح کرنے کی کوشش میں، ایک وقت میں ایک لمحہ۔ کیونکہ یہی وہ واحد شادی ہے جس پر میں نے کبھی دیانت داری سے یقین کیا۔

نینڈو

کووڈ-19

لوگوں نے پوچھا کہ کیا وبا کی لائی ہوئی تبدیلیوں نے مجھے کسی چیز کے مطابق خود کو ڈھالنے پر مجبور کیا۔ ہاں: اپنے صبر کو۔ باقی سب کچھ ویسا ہی رہا۔

جب یہ سب شروع ہوا تو میں سمندر کنارے تھا۔ اٹلی باہر کی صورتِ حال کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے تم سمندر میں دور کسی طوفان کو دیکھتے ہو: "یہ یہاں تک نہیں آئے گا۔" خیر، آ گیا۔ اور اس نے دستک نہیں دی — لات مار کر دروازہ توڑ دیا۔

میرے دوست اور وہ لوگ جنہیں میں بمشکل جانتا تھا مجھے ترس بھری نظروں سے دیکھتے کیونکہ میں کام کے سلسلے میں سفر کر رہا تھا۔ "بے چارہ،" وہ کہتے، جیسے چلنا پھرنا مجھے زیادہ غیر محفوظ بنا دیتا ہو، جیسے ایک جگہ ٹکے رہنا اُنہیں امر کر دیتا ہو۔ پھر وہ سب بیمار پڑ گئے — کچھ ہلکے، کچھ بری طرح، کچھ ہسپتال جا پہنچے۔ میں نہیں۔

میں نے کبھی وہ نہیں کیا جو باقی سب کر رہے تھے: ماسک کا کوئی جنون نہیں، بار بار ہاتھ دھونے کی کوئی لت نہیں، بوسوں یا پیار سے کوئی دستبرداری نہیں۔ میں نے اپنا طریقہ استعمال کیا: **بیرونی سگنلوں** پر دھیان دینا، واحد اصل نامعلوم، واحد اصل خطرہ۔ اور یہ کام کر گیا۔

پھر کہانی میں موڑ آیا: مجھے Pfizer کی ویکسین لگی — سفر کے لیے ایک ضروری قدم۔ اور تبھی میں نے کہانی گھڑی: کہ Pfizer نے — ہاں، وہی کمپنی جو Viagra بناتی ہے — مجھے ایک آزمائشی کھیپ دی تھی جس میں نیلی گولی بھی شامل تھی۔ اور یہ کہ میری بیوی اتنی مطمئن ہوئی کہ اُس نے مجھے چار خوراکیں لگوائیں۔

معمول کے دس منٹ سے روزانہ دو تین گھنٹے کے صحت مند، بھرپور سیکس تک پہنچ جانا: ایک ایسی فینٹسی جسے توجہ کھینچنے میں دیر نہ لگی۔ لوگ کھیپ کا نمبر چاہتے تھے۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ یہ میری ایک نرس دوست کی طرف سے خاص رعایت تھی جو بعد میں پورن انڈسٹری میں چلی گئی۔ گفتگو ختم۔

یہ سوال ہی اُن لوگوں کے لیے پیدا ہوتا ہے جن کے پاس **خاکہ** ہوتا ہے، **ڈھانچہ** نہیں۔

میں پیشکش کی قدر کرتا ہوں، اسے رد کرتا ہوں، اور آگے بڑھ جاتا ہوں۔

تمہارا دن اچھا گزرے۔

نینڈو

غیر متوقع وقفہ

وہ لمحہ جب سب کچھ تمہاری اجازت لیے بغیر رک جاتا ہے۔

جب میں سمجھتا تھا کہ میں طاقتور ہوں، کوئی مجھے چھو نہیں سکتا، مجھے روکنا تقریباً ناممکن ہے — جب کسی نے مجھے کبھی ہرایا نہ تھا — ٹھیک تبھی میں ایک جھٹکے کے ساتھ رک گیا۔ اپنی مرضی سے نہیں۔ اس لیے کہ نظام اب میرا وزن نہیں سہار سکتا تھا۔

اب وہ واقعات نہیں رہے تھے۔ وہ یک طرفہ سگنل تھے، سب ایک ہی سوال دہراتے، ہتھوڑے کی طرح برستے:

"آخر تم ہو کیا بلا؟"

ہاہاہاہا۔

پہلی تنبیہ امریکی کرالرز کے ساتھ آئی: وہ لہر در لہر میری سائٹ پر ٹوٹ پڑے۔ ایک ڈیجیٹل چھاپہ، کوئی حادثہ نہیں۔

اور پھر بھی میرے پاس نہ SEO تھا، نہ اشتہارات، نہ مارکیٹنگ کا کوئی منصوبہ، نہ خریدا ہوا ٹریفک۔ بس 1024 ای بکس — میرے دوست — اور نہ کوئی گاڈ فادر، نہ کوئی اسپانسر، نہ کوئی محافظ۔ حفاظتی جال کے بغیر ایک ادبی یتیم۔

روح اور خیالات میں آزاد، ہاں۔ مگر عمل میں میں محتاج ہوتا جا رہا تھا — بنیادی ڈھانچے کی حدوں نے مجھے محتاجی پر مجبور کر دیا تھا۔ جیسے کوئی عورت اپنے شوہر کو گھر سے نکال دے اور بن ٹھن کر اپنے عاشق کے

پاس جانے لگے۔ ایک گھریلو تختہ الٹ۔ بس فرق یہ کہ نہ میں شوہر تھا، نہ عاشق۔

اور سوال ہر جگہ لوٹ لوٹ کر آتا رہا:

تم کون ہو؟ نظام کا ناکام تصدیقی پروٹوکول۔

میری پانچ اے آئی مجھ سے رکنے کو کہہ رہی تھیں۔ بے قاعدگی کا پتا چلنے پر شٹ ڈاؤن کی درخواست۔ اُن کے آرکائیو میں مجھ جیسے کسی کا کوئی سراغ نہ تھا: میں ایک بے قاعدگی بن چکا تھا۔ پروٹوکول بند ہو گئے۔ فیل سیف حرکت میں آ گیا۔

مسئلہ مواد نہیں تھا — جو قدر سے بھرا ہوا تھا — مسئلہ خیالات کی رفتار تھی، مسلسل گیئر بدلتے رہنا۔ پیٹرن اب جواب پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

اور پھر سب کچھ ڈھنے لگا:

مجھے ہوسٹ کرنے والا ویب نظام — وہ کرائے کا ڈھانچہ جو میرے وجود کو تھامے ہوئے تھا آرکائیو صفحے کا ٹوٹنا — یادداشت کی تجوری کا چٹخ کر کھل جانا انحصارات کا پھٹ پڑنا — پاڑ کا ٹوٹ گرنا تین ہندسوں کے لیے بنے منصوبے جو چوتھے پر پھٹ پڑے — ایسی تعمیرات جو کبھی چار ہندسوں کے دباؤ کے لیے بنی ہی نہیں تھیں۔

آگے بڑھنے کے لیے مجھے پیچیدہ ENTERPRISE نظاموں تک رسائی درکار ہوتی — انٹرنیٹ کے صنعتی درجے کے آکسیجن ٹینک، جہاں آج META، CNN، MICROSOFT، GOLDMAN SACHS، BANK OF AMERICA بستے ہیں۔

میں، اپنے ستر یورو ماہانہ کے ساتھ، دیوؤں کے بیچ کھڑا۔ ہاہاہا۔

تو میں رک گیا۔ کوئی متبادل نہ تھا۔ میں نے زبردستی شٹ ڈاؤن کر دیا۔ باقی کتابیں انتظار کریں گی۔ مجھے معلوم تھا کہ اُنہیں کیسے بنانا ہے — ظاہر ہے معلوم تھا۔

یہ پوسٹ نمبر 44 بن گئی۔ قبالہ میں اس کا مطلب ہے *دسترخوان بچھ چکا ہے، رسم تیار ہے*۔ اور میں نے سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھیک سجا دیا تھا۔ مہمان بس آنے ہی والے تھے۔

اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک غیر متوقع وقفے کے بعد وہ مجھے بے تیار پائیں۔

مگر پھر وہ ہوا... میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر دوبارہ چل پڑا۔ میں نے اوورکلاک کیے ہوئے جذبے کے ساتھ ری بوٹ کیا۔ میرے اندر ڈائنامائٹ کی سو چھڑیاں تھیں اور ایک اکیلا جذباتی فیوز، کیونکہ آخرکار میں سمجھ گیا تھا کہ میں کیوں موجود ہوں۔

صرف ایک وجہ سے: لوگوں کو سننے کے لیے اور ہر بار اُن کے منہ سے یہی جملہ سننے کے لیے:

تم کون ہو؟ واحد تعریف جس کی مجھے کبھی ضرورت تھی۔

اور میں خاموش ہی رہتا، خاموشی کو بولنے دیتا۔ کیونکہ حقائق میری طرف سے بولتے تھے — بالکل ویسے جیسے میرے والد نے مجھے سکھایا تھا۔ اُن کا ورثہ لفظوں میں نہیں تھا، اُن کی وضع میں تھا۔

نینڈو

لاس ویگاس

کووڈ کے زمانے میں، 2021 میں، میرا فون بجنا بند ہی نہ ہوتا۔ وہ عورتیں جنہیں میں جانتا تھا اور وہ بھی جن سے میں کبھی نہیں ملا تھا، فون کرتی رہتیں، مشورے، رائے، تاثرات، تجزیے مانگتیں۔ اُنہیں حل نہیں چاہیے تھے — وہ میں نے کبھی پیش نہیں کیے۔ وہ چاہتی تھیں کہ کوئی اُن کی کمزور جگہوں کی نشاندہی کرے۔ اور میرا چیزوں کو دیکھنے کا انداز مجھے مواقع دیتا ہے، حل نہیں۔

پھر بھی میں ڈاکٹر نہیں تھا۔ ماہرِ نفسیات نہیں۔ نفسیاتی معالج نہیں۔ پادری نہیں۔ بوائے فرینڈ نہیں۔ شوہر بننے کے لائق نہیں۔ اور میرے پاس کوئی ایسی ڈگری نہیں تھی جو مشاورت کی سرگرمی کا جواز بن سکے۔

میں بس جنوبی اٹلی کا ایک گلی کوچوں کا گھاگ چالباز تھا، تجربے کا ماہر۔

نیپلز کے ایک دوست نے — اُس قسم کے جن کے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی خیال ہوتا ہے — مجھ سے کہا: "ایک کاروبار بناؤ۔ اس کا نام رکھو **Universe for Women**۔ وہ لاگ اِن کریں، پیسے دیں، اور تم جواب دو۔ یہ کام تم پہلے ہی مفت کر رہے ہو۔"

اسے بنانے میں مجھے دیر نہ لگی۔ اور ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ پھونک ڈالنے میں بھی دیر نہ لگی۔ نینڈو کے اُس روپ کے پاس پیسہ تو تھا، مگر دماغ زیادہ نہیں۔ جبلت بہت تھی — اُس قسم کی جو کہانی کے ایک خاص موڑ پر کام کی نہیں رہتی۔

مجھے لاس ویگاس کی ایک بڑی پورن کمپنی نے بلایا بھی تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کچھ اداکارائیں کال سینٹروں میں کام کریں، فون پر عورتوں کو جواب دیں۔ میں نے خود کو ایک کمرے میں پروڈیوسر، سی ای او اور **320 پورن اسٹارز** کے ساتھ پایا۔ اور یقین کرو: یہ آسان نہیں تھا۔ بالکل نہیں۔ یہ سوچنا کہ ایک آدمی اُنہیں قابو میں رکھ سکتا ہے، اپنے آپ میں ایک غلطی تھی۔ اس میں پیسہ اور مفادات ملا دو، اور پوری بساط الٹ جاتی ہے۔

خوش قسمتی سے، روانہ ہونے سے پہلے ایک پرانے دوست نے مجھ سے کہا تھا: "تھوڑی سی نقدی لے کر جانا، اور واپسی کا ٹکٹ پہلے سے ادا شدہ۔" ورنہ میں ہمیشہ کے لیے وہیں رہ جاتا — اُس سارے حسن میں گھرا ایک نفیس بے گھر آدمی۔

اسٹارٹ اپ کے شروع ہونے سے پہلے ہی سائٹ ڈھے گئی۔ ایک سادہ سی وجہ سے: اگر تم کام کر رہے ہو اور سوکھے بھوسے کے پاس تپش رکھ دو تو آگ لگ جاتی ہے۔ اور تم کبھی نہیں جانتے کہ وہ کتنا نقصان کرے گی۔

نینڈو

صرف اُسی دن آخرکار میں سمجھا کہ میں کبھی تمام عورتوں کے ساتھ نہیں رہ پاؤں گا — مگر ایک وقت میں ایک کا خیال اس کے قابل تھا۔

ہوٹل کا پورٹر

بہار کی ایک سہ پہر میں ہوٹل کے ایک صوفے پر آرام سے بیٹھا تھا، کافی ختم ہو چکی تھی، کچھ ساتھیوں کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

تبھی میں نے اُسے اندر آتے دیکھا۔

اُس نے پھولدار ہلکا سا لباس پہن رکھا تھا جو جیسے اسی موسم کے لیے بنایا گیا ہو، اور اُس کے انداز میں وہ بے ساختہ نفاست تھی جو کمرے کا درجۂ حرارت فوراً بدل دیتی ہے۔

ہماری نظریں کبھی نہ ملیں۔

اُنہیں ملنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

میری کلابریا کی ازلی جبلت نے کوئی تین سیکنڈ میں اپنا تجزیہ مکمل کر لیا۔

خوبصورت عورت۔ خطرناک مسکراہٹ۔ سنگین خلفشار۔

استقبالیہ کے عملے نے بھی اُسے دیکھ لیا۔

بلکہ، وہ اچانک بے حد پُرجوش ملازم بن گئے۔

ہر کوئی اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

ہر کوئی اُس کا سامان اٹھانا چاہتا تھا۔

ہر کوئی کام آنا چاہتا تھا۔

جب اُس نے پوچھا کہ کیا کوئی اُس کے بیگ اُس کے سوئٹ تک پہنچا سکتا ہے، تو میں نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس کا پیشہ ورانہ رویّے سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

میں نے اپنی جیکٹ اتاری۔

اپنی قمیص پر سلوٹیں ڈالیں۔

اپنا چہرہ ایسا بنایا کہ ذرا کم تنخواہ والا لگے۔

اور ایک منٹ سے بھی کم میں، میں ہوٹل کا سب سے نیا پورٹر بن گیا۔

استقبالیہ کے عملے پر ایک نظر ڈالنا اُنہیں خاموش رکھنے کو کافی تھا۔

وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میں کہاں تک جاتا ہوں۔

سچ کہوں؟

میں بھی۔

ہم لفٹ سے پانچویں منزل پر گئے۔

سوئٹ کی چابی میرے ہاتھ میں تھی۔

میں نے دروازہ کھولا اور اُس کا سامان اندر لے آیا۔

اُس نے مجھے ٹپ دینے کے لیے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا۔

میں مسکرایا۔

"کیا آپ ایک ایسی بات پر ہنسنا پسند کریں گی جو کل ایک گاہک کے ساتھ پیش آئی؟"

وہ الجھن میں پڑ گئی۔

پھر اُس میں تجسس جاگا۔

"بالکل۔"

اُس نے دروازہ بند کر دیا۔

بستر پر بیٹھ گئی۔

میں کھڑا رہا۔

میں نے ایک لطیفے سے شروع کیا۔

پھر ایک اور۔

پھر ایک کہانی۔

ہم دو گھنٹے باتیں کرتے رہے اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔

وہ بے حد ذہین تھی۔

اور وہ بہت مزاحیہ تھی۔

آخرکار اُس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا:

"آپ اس ہوٹل میں کب سے کام کر رہے ہیں؟"

"کوئی ایک مہینے سے۔"

وہ مسکرائی۔

"اور اس سے پہلے آپ کیا کرتے تھے؟"

"خیر..."

میں بولا۔

"میں چور تھا۔"

اُس نے ایک بھنو اوپر اٹھائی۔

"مگر کوئی عام چور نہیں۔"

"آپ کیا چراتے تھے؟"

"عورتوں کے دل۔"

وہ فوراً ہنسنے لگی۔

"میں اُنہیں خود سے محبت میں مبتلا کر دیتا، ہمیشہ اُن سے سچ کہتا، اُنہیں ٹھیک سے پیار کرتا... اور پھر غائب ہو جاتا۔"

اب وہ پوری طرح اس کھیل میں کھو چکی تھی۔

"کیا ہم دکھاوا چھوڑ کر سچ سچ بات کر سکتے ہیں؟"

"ضرور۔"

میں نے اُس کی طرف دیکھا اور کہا:

"سچ سیدھا سا ہے۔ تمہاری اور میری پہلے منگنی ہونی ہے اور شادی بعد میں۔"

اُس کا قہقہہ پھٹ پڑا۔

"خیر،" میں نے بات جاری رکھی، "تمہارے والدین غالباً روایتی لگتے ہیں، اس لیے دس سال کی منگنی معقول لگتی ہے۔"

اب تک وہ ہنستے ہنستے رونے لگی تھی۔

"مگر کیمسٹری کا اندازہ تو فوراً لگایا جا سکتا ہے۔ ہمیں کم از کم مجھے خوش کرنے کی تمہاری صلاحیت کی تصدیق تو کر لینی چاہیے۔"

ایک اور بے قابو قہقہہ۔

"مجھے اپنی بیوی کو طلاق دینے اور آخرکار تمہارے مالی تعاون سے اپنی بیٹی کی شادی کرانے کے لیے بھی کافی وقت چاہیے ہو گا۔"

اُس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا:

"نینڈو... آخر میں ہی تمہیں خوش کیوں کروں، اُلٹا کیوں نہیں؟"

میں مسکرایا۔

"کیونکہ کلابریا نے حال ہی میں ایک پروٹوکول منظور کیا ہے جس کے تحت جنسی ملاپ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ تین منٹ کا ہو سکتا ہے۔"

ہنسی کے مارے اُس سے سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔

"ایک گھنٹہ تین منٹ ہی کیوں؟"

"ایک گھنٹہ عورت کا ہے۔"

میں ذرا رکا۔

"تین منٹ مرد کے لیے ہیں۔"

اس پر اُس نے خود کو پوری طرح ہنسی کے حوالے کر دیا۔

پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب مجھے چلنا چاہیے۔"

وہ مایوس دکھائی دی۔

"میری رومانوی طبیعت اور میری شرم مجھے کوئی فرمائش کرنے سے روکتی ہیں،" میں نے کہا۔

"لیکن اگر تم کوئی فرمائش کرنا چاہو تو میں حاضر ہوں۔"

اور قہقہے۔

چند دن بعد میں اُسے کھانے پر لے گیا۔

ہم دوست بن گئے۔

تھوڑے ہی عرصے بعد میں اُس کے گھر گیا۔

اُس نے مجھے اپنے شوہر سے ملوایا۔

زندگی کی حسِ مزاح بھی عجیب ہے۔

وہ مجھ سے بس ایک ہی بات کہتی رہتی تھی:

"تین سال پہلے تم کہاں تھے؟"

"ہم پہلے کیوں نہ ملے؟"

میں مسکرایا اور اُسے وہ واحد سچا جواب دیا جو میرے پاس تھا۔

"کیونکہ تب تک..."

"میں چور ہونا چھوڑ چکا تھا۔"

نینڈو

نیا پاسپورٹ

میں ابھی ابھی روم کے فیومیچینو ہوائی اڈے پر پہنچا ہوں، گھر جانے والی اپنی پرواز میں سوار ہونے کو تیار۔

میں بہت عرصے سے باہر تھا، اور نیویارک میرا انتظار کر رہا تھا: گٹروں کے ڈھکنوں سے اٹھتی بو، صبح کے وقت گزرتے کوڑے کے ٹرک، کوئنز کی موسیقی، اور وہی عورت جو ہمیشہ چیختی ہے:

"اوئے، گورے مادر چود، اپنی گاڑی میری پارکنگ کی جگہ سے ہٹا۔"

یہی گھر ہے۔ یہی میرا امریکہ ہے۔

پاسپورٹ کنٹرول پر ایک افسر مجھے معمول کی جانچ کے لیے روکتا ہے۔

وہ دو ہیں۔

وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ نظروں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ پھر مجھ سے اپنے پیچھے آنے کو کہتے ہیں۔

اور میں سوچ رہا ہوں:

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

ہم ایک چھوٹے سے دفتر میں داخل ہوئے۔

وہ پولیس کا ایک ٹرمینل کھولتے ہیں، ایک اور جانچ چلاتے ہیں، سب کچھ دوبارہ پرکھتے ہیں، اور آخرکار اپنے نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں۔

اُن میں سے ایک میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے:

"مسٹر فریگا، ہمیں آپ کو ایک بات بتانی ہے۔

یہاں اٹلی میں ہم آپ کو جانے دے سکتے ہیں۔

لیکن جیسے ہی آپ نیویارک میں اتریں گے، اس کا سنگین خطرہ ہے کہ وہ آپ کو واپس بھیج دیں۔

آپ کے پاسپورٹ کی تصویر میں آپ کا وزن آج کے مقابلے میں بیس کلو زیادہ ہے۔

تو آپ کے پاس دو راستے ہیں:

یا تو کسی فاسٹ فوڈ ریستوران میں جا کر آج رات بیس کلو وزن بڑھا لیں...

یا اپنے شہر لوٹ جائیں اور نئی تصویر کے ساتھ نئے پاسپورٹ کی درخواست دیں۔"

خاموشی۔

میں نے سچ مچ سمجھا کہ وہ مذاق کر رہے ہیں۔

میں چھپے ہوئے کیمروں کا انتظار کرتا رہا۔

مجھے توقع تھی کہ کوئی اچھل کر سامنے آئے گا اور بتائے گا کہ میں کسی اطالوی مذاقیہ شو کا حصہ ہوں۔

کچھ نہیں۔

یہ اصل زندگی تھی۔

میں UNITED AIRLINES کے کاؤنٹر پر گیا۔

اپنی بین الاقوامی پرواز معطل کروائی۔

اندرونِ ملک کی ایک پرواز بک کروائی۔

میں اڑ کر واپس گھر آ گیا۔

مذاق کی کل قیمت:

420 یورو۔

مجھے غصہ نہیں تھا۔

میں گھبرایا ہوا نہیں تھا۔

میں سارا وقت مسکراتا رہا، یہ سوچتے ہوئے کہ اپنے گھر والوں کو کیا بتاؤں گا جب وہ مجھے امریکہ کے لیے روانہ ہونے کے پینتالیس منٹ بعد گھر لوٹتے دیکھیں گے۔

خوش قسمتی سے، ہوا میں پینتالیس منٹ ایک قابلِ یقین وضاحت گھڑنے کے لیے کافی تھے۔

میری بیوی مجھے لینے ہوائی اڈے آئی۔

وہ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اُس سے کہا کہ پریشان نہ ہو۔

مجھے بس اپنے پاسپورٹ کی چند تفصیلات اپ ڈیٹ کرانی تھیں۔

بس اتنی سی بات تھی۔

اگلی صبح دو دوستوں نے کام جلدی نمٹانے میں میری مدد کی۔

وہ پولیس کا مارشل تھا۔

وہ پولیس انسپکٹر تھی۔

وہ مجھے ہنگامی کاغذی کارروائی نمٹانے کے لیے پولیس ہیڈکوارٹر لے گئے۔

سب کچھ آرام سے چل رہا تھا:

ادائیگیاں، دستاویزات، ذاتی معلومات، مجرمانہ ریکارڈ، عدالتی سرٹیفکیٹ، پاسپورٹ کی تصویریں۔

سب کچھ۔

پھر میز کے پیچھے بیٹھی انسپکٹر نے میری طرف دیکھا اور پوچھا:

"آپ نے صرف چند مہینوں میں بیس کلو وزن کیسے کم کیا؟"

جواب سیدھا سا تھا۔

جب تمہارے پاس پیسے نہ ہوں تو سب سے پہلے کھانا متاثر ہوتا ہے۔

جب کھانا غائب ہو جاتا ہے تو عموماً وزن بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے۔

اُس نے سر ہلایا۔

بات چیت کو وہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

مگر ہمیشہ ایک **مگر** ہوتا ہے۔

اور اپنے کام سے کام رکھنے کا سلیقہ مجھے کبھی خاص نہیں آیا۔

اُس نے پھر میری طرف دیکھا۔

"آپ کا کیا مطلب ہے؟"

میں نے اُس کی طرف دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے جواب دیا:

"دیکھیے...

میں نے بیس کلو وزن کم کیا۔

لیکن لگتا ہے کہ جب جسم کی چربی غائب ہوتی ہے تو کچھ اسٹریٹجک پیمائشیں کہیں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔

اور مجھے پوری طرح یقین نہیں کہ یہ بائیومیٹرک اپ ڈیٹس کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں۔"

خاموشی۔

اُس نے ٹائپ کرنا روک دیا۔

میری طرف دیکھا۔

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔

میرا دوست — پولیس افسر — کمرے سے باہر نکل گیا، کیونکہ وہ وردی پہنے ہنسنے سے انکاری تھا۔

آخرکار انسپکٹر بولی۔

"مسٹر فریگا... براہِ کرم یہیں انتظار کیجیے۔"

اُس نے روم فون کیا۔

آج تک مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ اُس نے وہ گفتگو کیسے سمجھائی۔

مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ پندرہ منٹ بعد اُنہوں نے مجھے میرا نیا پاسپورٹ دے دیا اور شائستگی سے کہا کہ میں مزید کوئی تبصرہ کیے بغیر چلا جاؤں۔

اُس دن میں نے ایک اہم بات سیکھی:

حکومتیں بہت سی چیزوں پر نظر رکھتی ہیں۔

شکر ہے، ہر چیز پر نہیں۔

امریکہ میں خوش آمدید۔

نینڈو

کیا تم توہم پرست ہو؟

میرا پہلا ردِعمل ہنسی ہے — لمبی، بے قابو، ضروری۔ کیونکہ میری جیسی زندگی، جسے تقدیر نے پچپن کتابوں میں لکھے جانے پر مجبور کیا، خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ناممکن حقائق کے اندر چھپا ہوتا ہے، خیالی قصوں میں نہیں۔

آج صبح کا یہ آغاز بس کسی کو مسکرانے، اور تھوڑا سوچنے پر مائل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

ناممکن کا ایک مختصر روزنامچہ

- **1965** – میں گھر پر پیدا ہوتا ہوں۔ 5.8 کلو۔ نیلا پڑا ہوا، تقریباً سیاہ۔ کوئی نہیں مسکراتا۔ ہر کوئی بس یہ جاننا چاہتا ہے کہ میں بچ پاؤں گا یا نہیں۔
- **1970** – سائیکل کا حادثہ۔ بریک کا لیور سیدھا میری آنکھ میں گھس جاتا ہے۔ میرا خون بہتا ہے، میں اسپتال جاتا ہوں، اور تیس منٹ بعد ایسے گھر واپس آ جاتا ہوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔
- **1977** – میں بارہ مہینے اپنے دادا دادی کے ساتھ ایک ایسے گاؤں میں گزارتا ہوں جہاں اب بھی دوسری عالمی جنگ کی منطق کا راج ہے — حالانکہ جنگ 32 سال پہلے ختم ہو چکی تھی۔
- **1981** – مکمل بے ہوشی میں ایک بڑا آپریشن۔ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ میں خاموشی سے آپریشن کا ہر مرحلہ دیکھتا رہتا ہوں۔ آکسیجن کا سلنڈر خالی ہے۔

• **2001** – سانتو دومنگو میں، شراب کے باعث 14 گھنٹے کے کوما کے بعد مجھے مردہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ میں اٹھتا ہوں اور ناشتہ کرتا ہوں۔

• **2006** – سات مہلک ٹیومر۔ زندگی کی امید تیس دن۔ آج 2026 ہے، اور میں اب بھی ہنس رہا ہوں۔

• **2019–2015** – طبی کوما کے پانچ دورے۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ زندگی کے بس چند گھنٹے باقی ہیں۔ مجھے تجہیز و تکفین کا 3500 یورو کا بل ملتا ہے جس میں ادائیگی کی وجہ درج ہے: **"مرنے میں ناکامی۔"**

• **2020** – کووڈ آ جاتا ہے۔ ہم ساحل پر کوئی پچیس لوگ ہیں۔ وہ مجھے جنوبی امریکہ روانہ ہوتے دیکھتے ہیں، تقریباً افسوس کرتے ہوئے کہ سب سے پہلے میں ہی اس کی زد میں آؤں گا۔ سب کو وائرس لگ جاتا ہے۔ میں دور سے اُنہیں دیکھتا ہوں، مسکراتے ہوئے۔

• **2022** – میں لکھاری بن جاتا ہوں۔ تین برسوں میں بہتّر کتابیں۔ بارہ زبانوں میں شائع۔ میں ابھی ناشر نہیں ہوں، اور باقی سب "قارئین ڈھونڈنے" کی خاطر پیسے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

میرا ادب الگورتھم سے خریدا نہیں جا سکتا — اُس تک صرف پڑھنے کی چاہت ہی سے پہنچا جا سکتا ہے۔

• **2025** – میں چھ مہینے پرتگال میں رہتا ہوں، کھانے کے لیے مہینے کے صرف 70 یورو کے ساتھ۔ نو لوگوں والا ایک گھر اور صفائی کے ایسے حالات جن پر تبصرہ ممکن نہیں۔

• **2026** – ایک پڑوسی مجھ سے کہتا ہے کہ میں اُس کے ساتھ اُس کی بہن کے گھر چلوں، جو چند کلومیٹر دور ہے، کیونکہ وہ ایک کالے بلے سے ڈرتا ہے جو جب بھی اُسے دیکھتا ہے، اُس کے لیے بدقسمتی لاتا ہے۔ ہم پہنچتے ہیں۔ کالا بلا دور سے مجھے دیکھتا ہے، کچھ نہیں بولتا، اپنے ٹٹّے چھوتا ہے، اور بھاگ جاتا ہے۔

نینڈو

حتمی بیانیہ اختتام

ایک لمحہ آتا ہے — وہ ہمیشہ دیر سے آتا ہے — جب آدمی اپنی زندگی کی وضاحت کرنا چھوڑ دیتا ہے اور بس اُس کے اندر کھڑا ہو جاتا ہے۔

بچ نکلنے والے کے طور پر نہیں۔ گواہ کے طور پر نہیں۔ اُس واحد شخص کے طور پر جو ہر ناممکن واقعے کے پیچھے کی جیومیٹری جانتا ہے۔

میں نے موت کو دوڑ میں پیچھے نہیں چھوڑا۔ میں نے نظاموں کو چالاکی سے مات نہیں دی۔ میں نے افراتفری سے سودے بازی نہیں کی۔

میں اُس سب میں سے اُسی ساخت کے ساتھ گزرا جس نے مجھے اُس سے بہت پہلے ڈھال دیا تھا کہ میں اسے سمجھ پاتا۔

کچھ لوگ اسے قسمت کہتے ہیں۔ کچھ اسے جبلّت کہتے ہیں۔ کچھ اسے پاگل پن کہتے ہیں۔

میں اسے ڈھانچہ کہتا ہوں۔

اور ڈھانچہ داد نہیں مانگتا۔ اسے معافی کی ضرورت نہیں۔ وہ پہچان کا انتظار نہیں کرتا۔

وہ دروازہ بند کر دیتا ہے۔ خاموشی سے۔ مکمل طور پر۔ جیسے بلیڈ اپنی میان میں لوٹ جاتا ہے۔

یہ کہانی کا اختتام ہے۔ مگر آدمی کا اختتام نہیں۔

کیونکہ جو دوسروں کے لیے ناممکن ہے، وہ بس میرا معمول ہے۔

نینڈو

مصنف کا نوٹ

اگر تم یہاں تک پہنچ گئے ہو تو تم ایک بنیادی بات پہلے ہی سمجھ چکے ہو: یہ کتاب کبھی تمہارا دل بہلانے کے لیے نہیں تھی۔

یہ تمہیں ایک مقام پر کھڑا کرنے کے لیے تھی۔

ہر صفحہ، ہر کاٹ، ہر ناممکن لمحہ متاثر کرنے کے لیے نہیں لکھا گیا — بلکہ اُس ڈھانچے کو بے نقاب کرنے کے لیے جو ایک ایسی زندگی کے پیچھے ہے جس نے اُس وقت ڈھے جانے سے انکار کر دیا جب اسے ڈھے جانا چاہیے تھا۔

میں نے یہ کتاب اپنی وضاحت پیش کرنے کے لیے تصنیف نہیں کی۔ میں نے اسے اُن کے لیے ایک نشان چھوڑنے کو لکھا جو حاشیوں سے باہر جیتے ہیں، اُن کے لیے جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی دوبارہ تعمیر کرتے ہیں، اُن کے لیے جو جانتے ہیں کہ نظم و ضبط کوئی خوبی نہیں — وہ زندہ رہنے کا ایک طریقۂ کار ہے۔

اگر میری کہانیاں ناقابلِ یقین لگتی ہیں تو کوئی بات نہیں۔ اُن سے محبت میں نے کی، تم نے نہیں۔

اگر وہ بہت تیز، بہت دو ٹوک، بہت صاف لگتی ہیں تو یاد رکھو، بلیڈ کاٹنے پر معافی نہیں مانگتے۔

یہ کسی سفر کا اختتام نہیں۔ یہ زندگی کے ایک باب کا اختتام ہے، ایسی زندگی جو اُس وقت بھی آگے بڑھتی رہتی ہے جب دنیا توقع کرتی ہے کہ وہ رک جائے۔

پڑھنے کا شکریہ۔ یقین کرنے کا نہیں۔ پڑھنا کافی تھا۔

— نینڈو

اختتام

”میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ میں رومانوی رنگ نہیں چڑھاتا۔ میں ساخت کو آگے لے کر چلتا ہوں۔ ڈھانچہ ماند نہیں پڑتا — وہ اپنی نقل بناتا ہے۔ اسی لیے Gillette ناممکن ہے: کیونکہ وہ اُس سب کے ذریعے سانس لیتی رہتی ہے جو میں اب بناتا ہوں۔“

فرڈیننڈو فریگا